کتاب و سنت اور اسلافِ امت کی تعلیمات کا علمبردار

ماہنامہ

اشرف الجرائد حیدرآباد

Volume:15 Issue:5 May 2022

مدیر

مولانا محمد عبد القوی

ادارہ اشرف العلوم ٹرسٹ حیدرآباد

www.iauth.in

اشرف الجرائد میں شامل تمام مضامین کی تمام جزئیات سے مدیر کا اتفاق ضروری نہیں

اشرف الجرائد کی توسیع واشاعت میں حصہ لے کر اشاعتِ دین کا ثواب حاصل فرمائیں۔ ادارہ

رمضان میں ملی روحانی سوغات کی قدر کریں

از: مولانا محمد عبدالقادر فرید قاسمی*

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

فَمَنْ کَانَ یَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّہٖ فَلْیَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا یُشْرِکْ بِعِبَادَۃِ رَبِّہٖٓ اَحَدًا

(سورۃ الکہف:110)

ترجمہ: لہذا جس کسی کو اپنے مالک سے جا ملنے کی اُمید ہو اُسے چاہیئے کہ وہ نیک عمل کرے اور اپنے مالک کی عبادت میں کسی اور کو شریک نہ ٹھہرائے۔

توضیح: رمضان المبارک کا عظیم مہینہ اپنے اندر روحانی انقلاب پیدا کرنے اور مغفرت کو یقینی بنانے کا ہے، قدرت کی جانب سے ماحول ہی کچھ ایسا سازگار ملتا ہے جس میں ترک معصیت کی ہمت پیدا ہو جاتی ہے، اوامر پر عمل کرنے کا حوصلہ بھی مل جاتا ہے، عامی مسلمان بھی اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ برکات رمضان سے کچھ مستفید ہو جائے، ہر قدرداں کو رمضان میں کی گئی اپنی بساط بھر عبادتوں، ریاضتوں کا فائدہ حاصل ہو جاتا ہے، دل نرم پڑ جاتے ہیں، معصیت سے قدرے نفرت ہونے لگتی ہے، اعمال صالحہ کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، مابعد رمضان اپنی زندگی کو منظم و مرتب کرنے کا ارادہ ہونے لگتا ہے، روزے کی برکت سے فاقہ مستوں کے درد کا احساس ہوتا ہے، خیر خیرات سے حب مال پر کسی قدر ضرب لگتی ہے، نمازوں کی فکر پیدا ہو جاتی ہے، لایعنی اقوال افعال سے بچنے کی ہمت بن جاتی ہے؛ لیکن ان سب کے باوجود بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جن کے ارادوں، عزائم میں پختگی باقی رہتی ہے، وہ کسر ہمت کے شکار نہیں ہوتے، وہ رمضان میں ملنے والی سوغات کی پوری سال حفاظت کرتے ہیں اور یہ قبولیت عمل کی علامت بھی ہے، بزرگوں کا فرمان ہے کہ جن کو اعمال پر مداومت اور استقامت کی دولت مل جائے اور اس عمل سے دوسرے عمل کے کرنے کا شوق پیدا ہو تو یہ پہلے

* ذمہ دار ادارہ حسیب المدارس، حیدرآباد

والے عمل کی قبول ہونے کی علامت ہے، کئی احادیث میں مداومت اور استقامت اعمال کی ترغیب اور عنداللہ اس عمل کے محبوب ہونے کی بات بتلائی گئی، سورۂ کہف کی آخری آیت میں ہر اس بندے کو مخاطب بنا کر تاکید کی گئی ہے جو کہ لقاء رب کا خواہش مند ہے کہ اگر تم کو اپنے رب سے ملنے کی آرزو تمنا ہے تو پھر اعمال صالحہ کا سلسلہ جاری رکھو اور اس عمل کو اخلاص کے ساتھ مزین بھی کرو، کیوں کہ نیکی میں عدم اخلاص بطلان عمل کا ذریعہ ہو جاتی ہے جب کہ نیکی کرنے والے کا خیال رہتا ہے کہ اس نے بہت کچھ نیکی کمائی ہے حالاں کہ وہ اس کا خیال محض ہوتا ہے وَهُمْ يَحْسَبُونَ أَنَّهُمْ يُحْسِنُونَ صُنْعًا

دوسری ایک اہم یہ بات بھی پیش نظر ہونا چاہیے کہ نیکی کا کرنا اتنا مشکل نہیں جتنا کہ نیکی کی حفاظت کرنا مشکل ہوتا ہے، بہت سے قابل ترس وہ لوگ ہوتے ہیں جو بڑے جذبے کے ساتھ ثواب کے کام کرتے ہیں، پہاڑوں جیسا اجر جمع کرتے ہیں پھر کچھ ایسی بے احتیاطیاں کرتے ہیں جس سے یہ نیکیوں کا پہاڑ هَبَاءً مَّنثُورًا ہو کر رہ جاتا ہے بندے کے ہاتھ کچھ نہیں لگتا۔

ہم اپنے مالک حقیقی کے غلام ہیں، تادم حیات اس کی مرضیات پر چلنا اس کی رضا کی جستجو میں لگے رہنا، اس کے مواخذے سے ڈرتے رہنا، یہ حقیقی غلامی کے تقاضے اور حیات مستعار کا مقصد ہے، جس رب کو ہم نے رمضان میں تلاش کیا اس کو خوش کرنے کے لیے مشقتیں برداشت کیں، اس کے روبرو اپنے بندے ہونے کا ثبوت دیا، اب رمضان کے بعد بھی یہ احساس تازہ رہنا چاہیے کہ وہی رب سال کے اور مہینوں میں بھی ہمارے اعمال واقوال پر نظر رکھے ہوئے ہے۔

لہٰذا جس کسی کو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس رمضان میں نیک اعمال کرنے کا موقع ملا اور تقویٰ کا جو مزاج بنا یہ خدا تعالیٰ کی طرف سے سوغات سمجھ کر عزم کرنا چاہیے ہے کہ ہم اس سوغات کی قدر کریں گے اور اس کی قدر یہ ہے کہ رمضان کے بعد بھی وہی منظم و مرتب زندگی گزاریں گے جو رمضان میں اور خصوصاً اخیر عشرے میں گزار رہے تھے اور اس بات کی بھی پوری کوشش کریں کہ ہماری ذات سے کوئی ایسا کام سرزد نہ ہو جس سے ہمارے اعمال کا اجرا کارت اور تقویٰ والی کیفیت مضمحل اور کمزور پڑ جائے۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کی ناقص عبادتوں کو شرف قبولیت عطا فرمائے، تقصیرات سے صرف نظر فرمائے، رمضان کے بعد بھی اپنی مرضیات پر چلنے کا حوصلہ عطا فرمائے۔ آمین

اسلام کا جامع ترین وصف "استقامت"

از: مولانا مفتی محمد احمد علی قاسمی*

عن أَبِي عَمْرٍو رضی اللہ عنہ وَقِيلَ: أَبِي عَمْرَةَ رضی اللہ عنہ، سُفْيَانَ بْنِ عَبْدِاللهِ الثَّقَفِيِّ رضی اللہ عنہ قَالَ: قُلْتُ: يارَسُولَ اللهِ، قُلْ لِي فِي الإِسْلامِ قَوْلًا لا أَسْأَلُ عَنْهُ أَحَدًا غَيْرَكَ، قَالَ: "قُلْ: آمَنْتُ بِاللهِ ثُمَّ اسْتَقِمْ" (رواہ مسلم:۳۸)

ترجمہ: حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا: اے اللہ کے رسول! مجھے اسلام میں ایک ایسی بات بتا دیجئے کہ میں اس کو آپ کے بعد کسی اور سے نہ پوچھوں، (یعنی کوئی ایسا جامع اسلامی وصف بتلایئے جو فلاح ونجات کا ضامن ہو) آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تم کہو: میں ایمان لایا اللہ پر، پھر اس پر جمے رہو۔

تشریح: حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دراصل استقامت کی تعلیم ونصیحت فرمائی ہے، جو نہایت ہی جامع وکافی نصیحت ہے" استقامت کے معنی سیدھا کھڑا رہنے کے ہیں، جس میں کسی طرف ذرا جھکاؤ نہ ہو، ظاہر ہے کہ یہ کام آسان نہیں، کسی لوہے پتھر وغیرہ کے عمود کو ماہر انجینئر ایک مرتبہ اس طرح کھڑا کر سکتے ہیں کہ اس کے ہر طرف زاویہ قائم ہی رہے، کسی طرف ادنی میلان نہ ہو، لیکن کسی متحرک چیز کا ہر وقت ہر حال میں اس حالت پر قائم رہنا کس قدر مشکل ہے وہ اہل بصیرت سے مخفی نہیں؛ استقامت لفظ تو چھوٹا سا ہے، مگر مفہوم اس کا ایک عظیم الشان وسعت رکھتا ہے؛ کیوں کہ معنیٰ اس کے یہ ہیں کہ انسان عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق، معاشرت، کسب معاش اور اس کے آمد وصرف کے تمام ابواب میں اللہ جل شانہ کی قائم کردہ حدود کے اندر اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر سیدھا چلتا رہے، ان میں سے کسی باب کے کسی عمل اور کسی حال میں کسی ایک طرف جھکاؤ یا کمی زیادتی ہو جائے تو استقامت باقی نہیں رہتی۔ (معارف القرآن: ۴/۸۶)

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

ایمان لانے کے بعد اس پر ثابت قدمی اور کسی حال میں اس سے انحراف کو گوارہ نہ کرنا، پھر ایمان واسلام کے مقتضیات پر کما حقہ عمل کرتے رہنا، صرف بہت بڑا مجاہدہ ہی نہیں بل کہ بہت بڑی کرامت ہے، جس کو قرآن وحدیث کی زبان میں "استقامت" کہا گیا ہے، استقامت کی صفت اپنے تمام بندوں میں اللہ تعالیٰ کو مطلوب ہے،" فاستقم کما امرت و من تاب معک و لا تطغوا " رمضان کے مہینہ کے مبارک ومسعود ساعات اور نورانی ماحول میں ہر شخص کو اعمال صالحہ کے اہتمام اور اعمال سیئہ سے اجتناب کی توفیق ہوتی ہے، روزہ کی عبادت کے ذریعہ یہی مقصود ہے، لہذا اللہ تعالیٰ نے ہمیں ماہ مقدس عطا کر کے جو نیک توفیقات سے نوازا ہے اس پر شکر بھی ادا کریں، اور رمضان کے بعد استقامت واستدامت کے لئے کوشاں بھی رہیں، رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے اللہ تعالیٰ کو وہ دینی عمل سب سے زیادہ پسند ہے جسے آدمی پابندی سے کرے، کان احب الدین الیہ مادام علیہ صاحبہ (سنن نسائی:1643) ایک حدیث میں ارشاد فرمایا: اللہ تعالیٰ کے یہاں محبوب ترین کام وہ ہے جس پر ہمیشہ عمل کیا جائے؛ اگرچہ وہ قلیل ہے احب الاعمال الی اللہ تعالیٰ ادومها وان قل (صحیح مسلم: 1830) معلوم ہوا کہ اعمال پر استقامت اور ہیشگی ہی اللہ کو پسند ہے، اور یہی چیز عند اللہ قبولیت کی علامت بھی ہے، اس لئے جن نیک اعمال کی من جانب اللہ توفیق حاصل ہوئی ہے ہمت کر کے نہ صرف اس کو برقرار رکھا جائے بلکہ ترقی کی بھی فکر کرتے رہیں، فرض نمازیں باجماعت سنن قبلیہ بعدیہ کے ساتھ ہوتیں رہیں ہیں تو اس کو ما بعد رمضان بھی جاری رکھنے کی کوشش کریں، پورا مہینہ بفضلِ خداوندی روزہ رہیں ہیں تو حسبِ ہمت وموقعہ نفل روزوں کا گاہ بگاہ اہتمام کریں، زکوٰۃ صدقات کا جس طرح مبارک مہینہ میں عمل رہا اسی طرح سال بھر حسبِ استطاعت خیرات وانفاق کی فکر کریں، اس کے علاوہ تمام نیک اعمال جنہیں ہم ماہِ مبارک میں انجام دے رہے تھے ہمت وارادہ کر کے مابعد رمضان بھی اس کو قائم ودائم رکھیں، بالخصوص ماہِ مقدس میں جس طرح گناہوں سے نافرمانیوں سے روزہ کی برکت سے بچتے رہے رمضان کے بعد بھی بچتے رہیں، نعمہائے الٰہی اور خوفِ خدا کا استحضار ہمیشہ رکھیں، اس سے اعمالِ صالحہ کی توفیق اور گناہوں سے اجتناب کی ہمت ہوتی ہے۔

اگر اس طرح ہم ایمان واعمال ایمان پر عزم مصمم کر کے استقامت وہیشگی پر عمل پیرا رہیں تو ان شاء اللہ اُس نصیحت پر کسی قدر عامل ہوں گے جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت سفیان بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ کو فرمائی" قل آمنت باللہ ثم استقم " اللہ پاک ہم سب کو استقامت کی دولت سے مالا مال فرمائے۔ آمین۔

محبت جس کو حاصل، اس کو حاصل استقامت ہے
کوئی بھی حال ہو، ہر حال میں اس کو راحت ہے

پیش گفتار

اسلام، رمضانی مذہب نہیں ![1]

از: مدیر

ناظرین کرام کی خدمت میں عید کی پر خلوص مبارکباد پیش ہے۔ خدا کرے کہ آپ نے ماہِ مبارک کی کماحقہٗ قدر کی ہو اور اب اس موسمِ بہار کے اثرات وثمرات، انمٹ نقوش وتأثرات اور قلب ودماغ میں سرایت شدہ انوار وبرکات کو لے کر سال بھر روحانی ونورانی زندگی گزارنے کے عزم کے ساتھ عیدگاہ سے لوٹے ہوں، میں اپنے لئے بھی اور آپ سب کے لئے بھی حق تعالیٰ سے دعا گو ہوں کہ وہ ربِ قدیر وکریم اپنے کرم سے ہم سبھوں کے لئے زندگی بھر راہِ مستقیم پر چلنا سہل فرمائے، اور اپنی مرضیات کے اتباع کی توفیق نصیب فرمائے آمین۔

قابلِ احترام قارئین! ماہِ مبارک ۳۰ دنوں تک رحمت، مغفرت اور جہنم سے نجات کی سوغات تقسیم کرنے کے بعد چلا گیا۔ گویا پورے آب وتاب اور بھر پور شباب کے ساتھ آیا اور امتِ مسلمہ کے فرزندوں کے دامنِ مراد کو بھر کے رخصت ہو گیا۔ لیکن ہم سب دیکھ رہے ہیں کہ جیسے ہی شوال المکرم کا چاند نظر آیا مسجدیں ویران ہو گئیں اور اعمال واذکار کی باغ وبہار ختم ہو گئی، قرآن حسین جزدانوں میں ایک سال کے لئے پھر محفوظ کر دیئے گئے، مصلے الماریوں اور صندوقوں میں لپیٹ کر رکھ دیئے گئے، عوام وہی ہفتہ واری نماز کی عادت پر واپس ہو گئے، اور خواص کے جذبہ ہائے ایثار اور شوقِ طاعت ماند پڑ گئے۔ گویا مسلمانوں نے ابناءِ وطن اور اقوامِ زمن کے سامنے بالاتفاق ثابت کر دیا کہ اسلام کوئی آفاقی وابدی مذہب کا نام نہیں بلکہ سال میں ایک ماہ کے جوش وخروش کا نام ہے۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ باللہ۔

حالاں کہ اسلام نے اپنے کو دیگر ادیان ومذاہب سے اس قدر ممتاز ومنفرد خصوصیات کا حامل بنا کر پیش کیا ہے کہ کسی مذہب، کسی تہذیب کے ساتھ کسی قسم کے تشبہ کو پسند نہیں کرتا، حتیٰ کہ یہ وارننگ بھی اس نے اپنے پرستاروں کو دے دی ہے کہ جو کسی اور قوم سے مشابہت اختیار کرے گا تو وہ اُسی قوم کا فرد سمجھا جائے گا۔ فرزندانِ

[1] یہ پیش گفتار مدیر محترم مدظلہٗ کے مجموعہ مضامین ''مقالاتِ اصلاحی'' جلد دوم سے ماخوذ ہے۔

اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہ ہوگا۔ مثلاً یوم عاشورہ کے بارے میں آیا ہے کہ یہودی اُس دن روزہ رکھتے تھے، نبئ رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھی اس دن روزہ رکھنے کی واقعیت اور نبوی نسبت کی وجہ سے پسند تھا روزہ رکھا جائے، اس لئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی روزہ رکھا، اور اس عمل کو اسلام میں برقرار رکھنے کی تعلیم دی، مگر ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمادیا کہ "اگلے سال میں رہا تو دوروزے رکھوں گا" تاکہ یہودیوں سے مشابہت نہ رہے۔ اسی طرح سحری کو بابرکت قرار دیکر اس کی ترغیب دی تو ساتھ ہی ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ہمارے اور یہودیوں کے روزے میں سحری ہی سے فرق ہوتا ہے۔ سوچنے سے اس کی سینکڑوں مثالیں اسلامی تعلیمات میں ملیں گی۔

اب ذرا ٹھنڈے کلیجے سے غور کیجئے کہ ملتِ اسلامیہ کی اکثریت ہفتہ میں ایک دن یعنی صرف جمعہ کی نماز کا اہتمام اور ہفتے کے بقیہ دنوں میں اس سے بالکل قطع تعلق کر کے کہیں یہودیوں، عیسائیوں، اور ہندوؤں کے ہفتہ وار "پریئر" سے مشابہت تو نہیں اختیار کر رہی ہے؟ اور برس کے بارہ مہینوں کے مقابلہ میں صرف رمضان کو ماہِ عبادت واطاعت قرار دینے میں کہیں شیعوں کی اربعین اور ایپّا سوامی والوں کے ساٹھ دن سے عملی مشابہت تو نہیں ہو رہی ہے۔؟؟؟

یاد رہے کہ مذکورہ تشبیہ میں میرا اشارہ اس طبقہ کی طرف نہیں ہے جو سال بھر بھی طاعت وفرمانبرداری والی زندگی گذارتے ہیں اور اس قسم کے مبارک مواقع ومبارک اوقات میں اسکے اہتمام کو اور بڑھا دیتے ہیں، اس لئے کہ یہ تو عین مطلوب اور شارع کے نزدیک محبوب عمل ہے۔ بلکہ میری گفتگو اُن بھائیوں سے ہے جو خاص مواقع پر اپنی صلاحیت وزندہ ضمیری کا ثبوت دینے کے بعد اچانک اس طرح ماحول میں کھو جاتے ہیں گویا اسلام ان کے حق میں صرف ایک ماہ کیلئے ہی آیا تھا اور اب وہ آزادی ومن پرستی کے مختار ہیں، اسلام اور اسلامی احکامات کے پابند نہیں!

میرے پیارو، دوستو، بزرگو! دنیا کی اس سب سے برحق اور برتر قوم کے لئے کیا یہ ضروری نہیں کہ وہ اپنی مسلسل اطاعت اور شب وروز کی فرمابرداری کے ذریعہ اقوامِ عالم پر عملاً یہ واضح کردے کہ اسلام، تمہاری طرح چند رسم ورواج اور چند تخیلات وتصورات کے مجموعہ کا نام نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسا زندہ وتابندہ مذہب ہے کہ صرف اسی کو مکمل دین اور مستقل تہذیب ہونے کا شرف حاصل ہے کسی اور مذہب کو نہیں۔ یا یوں کہیے کہ اسلام سمندر کی طرح ایک اٹل وجود، اور نا قابلِ تسخیر حقیقت ہے اور دنیا کے تمام مذاہب ندی نالوں اور چشموں کے مانند ہیں کہ اگر انھیں اپنا وجود ہمیشہ کے لئے برقرار رکھنے کی تمنا ہے تو اپنی اپنی جگہ سرکشی کرتے رہنے کے بجائے اس سمندر میں اپنے آپ کو ضم کرلیں اور اپنے وجود کو مٹادیں، ورنہ سمندر سے اٹھنے والے طوفان اور بادوباران

خود ہی انھیں گھسیٹ کے اپنے اندر ضم کرلیں گے۔

مسلمانو! ایک ایسے وقت میں کہ دنیا نفسانیت وشہوانیت کے تقاضوں کو اپنا معبود بنا کر اسکی پرستش میں حیوانیت ودرندگی کی سطح سے بھی نیچے گر جانے کے بعد کچھ نہ پا کر اور مایوس اور نامراد ہوکر واپس آرہی ہے اور کسی "روحانی زندگی" کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ اسلام کو کیا یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے فرزندوں سے اس کی توقع رکھے کہ وہ اپنے مسنون سراپا اور اسلامی شب وروز کے ذریعہ اس ہراساں وپریشاں انسانیت کے قلوب کو جیت لیں اور ان کی درد کی دوا ثابت ہوجائیں؟ اور اگر ہے تو پھر آپ اپنے کو اسکا کس قدر اہل ثابت کرسکتے ہیں اور اس بجا توقع کی تکمیل میں کتنا حصہ لے سکتے ہیں؟! آج یہ سوال ہر باضمیر اور اسلام پسندی کے دعویدار فرد یا جماعت کے سامنے موجود ہے۔

یاد رکھئے! اسلام نے جب بھی اپنے کو منوایا ہے تو عمل سے منوایا ہے تحریر وتقریر، حجج ودلائل اسلام فہمی میں محض مددگار کی حیثیت رکھتے ہیں، ان سے اسلام کی حقیقی تصویر پیش کرنا ممکن نہیں۔ اسلام کی توسیع واشاعت اور اس کی دعوت کا مؤثر ذریعہ "اجتماعی عملی زندگی" ہے، نہ کہ صرف عقلی وعلمی اثبات، بحث ومباحثہ اور محض مجادلہ ومناظرہ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام اصلاً ایک ''عملی زندگی'' ہے نہ کہ کوئی ''نظریاتی بحث''!

پس عملی نمونے کے بغیر اسلامی دعوت کی باتیں کرنا، اور یکّا دکّا قبولیتِ اسلام کے واقعات پر فخر کرنا "طفل تسلی کے سامان" سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا!

اسی لئے قرآن کا اعلانِ عام ہے: "اے ایمان والو! پورے پورے اسلام میں داخل ہوجاؤ اور شیطان کی چال نہ چلو وہ تمہارا کھلا دُشمن ہے"۔

آیئے ارادہ کریں گے کہ ابھی رمضان المبارک کے بابرکت اثرات اور انوار ہماری زندگیوں میں موجود ہیں عملی زندگی تقویٰ وطہارت کا ماحول بہت دور نہیں چلا گیا ہے۔ ان اثرات وبرکات کو باقی رکھنے، جمے رہنے اور اسے پھیلانے کے لئے کمرِ ہمت کس لیں گے اور نفس وشیطان کے حملوں سے محفوظ رہنے کی مسلسل جدوجہد کرتے رہیں گے۔

یاد رکھئے! اس کا نسخہ، خود ہمت کرنا، ہمت کرنے والوں کی صحبت میں رہنا اور اللہ تعالیٰ سے ہمت وتوفیق طلب کرتے رہنا ہے۔

گوشۂ سیرت

رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی اُمت کی خصوصیات

از: مولانا سید خواجہ نصیر الدین قاسمی*

حضرت وہب بن منبہؒ نے بیان کیا کہ جب حق تعالیٰ شانہ نے سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام کو سرگوشی کے لئے قرب خاص عطا فرمایا تو انہوں نے عرض کیا:

اے میرے رب! میں نے تورات میں ایسی امت کا ذکر پایا جو بہترین امت ہے لوگوں کو بھلائی کی دعوت دیتی ہے اور برائیوں سے منع کرتی ہے اور اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتی ہے۔ تو آپ اس کو میری امت بنا دیجئے

حق تعالیٰ نے فرمایا: وہ تو احمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی اُمت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! میں نے تورات میں ایسی امت کا حال پڑھا جو دنیا کی قوموں میں سب سے آخر میں ہوگی اور قیامت میں پہلے آنے والوں میں ہوگی، تو اسے میری اُمت بنا دیجئے!

حق تعالیٰ نے فرمایا: وہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی اُمت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! مجھے تورات میں ایسی امت کا ذکر ملا جن کی کتابِ (الٰہی) ان کے سینوں میں محفوظ ہے وہ اُسے یاد کرتے ہیں اور پڑھتے ہیں، اور ان سے پہلے کی قومیں اپنی کتابیں دیکھ کر پڑھتی تھیں اُسے یاد نہیں کرتی تھیں، اس قوم کو آپ میری اُمت بنا دیجئے!

حق تعالیٰ نے فرمایا: وہ تو احمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی اُمت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! میں نے تورات میں ایسی امت کا تذکرہ پایا جو پہلی اور آخری کتاب پر ایمان رکھتی ہے، اہلِ ضلالت سے مقابلہ کرتی ہے، یہاں تک کہ کانے کذاب (دجال) سے جہاد کرے گی اس اُمت کو آپ میری اُمت بنا دیجئے!

حق تعالیٰ نے فرمایا: وہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کی اُمت ہے۔

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! میں نے تورات میں ایسی امت کا ذکر پایا جو اپنے صدقات خود (استعمال کر کے) کھاتی ہے، (یعنی اس اُمت کے امراء کے صدقات وخیرات اُمت کے غرباء کے کام میں آجاتے ہیں) جبکہ ان سے پہلے حال یہ تھا کہ کوئی اپنا صدقہ پیش کرتا تو اللہ تعالیٰ آگ بھیجتے وہ آگ صدقے کو کھالیتی (وہی اس کی قبولیت کی علامت تھی) اگر قبول نہ ہوتا تو آگ اس کے قریب بھی نہ آتی۔ آپ اس امت کو میری اُمت بنا دیجئے!

حق تعالیٰ نے فرمایا: وہ تو احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اُمت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! مجھے تورات میں ایسی امت کا حال معلوم ہوا جب وہ بُرائی کا ارادہ کرتی ہے تو (اس کے نامہ اعمال میں) کچھ لکھا نہیں جاتا، اگر اس بُرائی کو انجام دے تو صرف ایک خطا لکھی جاتی ہے، اور جب وہ کسی نیکی کا ارادہ کرے اور نیکی ابھی نہ کرے تو بھی اس کے لئے ایک نیکی لکھی جاتی ہے اور اگر نیکی کرے تو اس کے لئے اجر دس گنا سے سوگُنا تک بڑھا کر لکھا جاتا ہے، اس اُمت کو میری اُمت بنا دیجئے۔

حق تعالیٰ نے فرمایا: وہ تو محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اُمت ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا: اے میرے رب! مجھے تورات میں ایسی امت کا ذکر ملا جو دعائیں مانگتی ہے تو قبول ہوجاتی ہیں، اس کو میری اُمت بنا دیجئے۔

حق تعالیٰ نے فرمایا: وہ تو احمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اُمت ہے۔

(دلائل النبوۃ للبیہقی: ۱/۳۰۰)

فوائد: امتِ مسلمہ اس روایت کو پڑھے اور تفاخر اور شیخی بازی کے لئے نہیں بلکہ اس لئے کہ اُن صفات کو جو اس میں بیان کی گئیں ہیں اُسے اپنی عملی زندگی کا حصہ بنائے، اور سوچے کہ حق تعالیٰ کی کیسی کیسی مہربانیاں نبی رحمت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صدقے اس اُمت کو ملی ہیں، سیدنا حضرت موسیٰ علیہ السلام اس اُمت کی ایک ایک خصوصیت بیان کر رہے ہیں اور تمنا ظاہر فرما رہے ہیں کہ اُسے میری اُمت بنا دیجئے۔ اور جواب ایک ہی مل رہا ہے کہ یہ امتیازات نبی آخر الزماں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اُمت کو عطا کئے گئے ہیں۔ فللّٰہ الحمد اولا و اخرا۔

وصلی اللہ علی النبی الکریم وعلی اٰلہ وصحبہ اجمعین الی یوم الدین

گوشہ خواتین

اسلام کی باکمال خواتین

حضرت ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا

از: مفتی رفیع الدین حنیف قاسمی*

ام کلثوم کے نام کے تعلق سے تمام کتب سیر میں کوئی صراحت نہیں ملتی، البتہ یہ اپنی کنیت ''ام کلثوم'' سے معروف ہیں، بڑی عظیم اور جلیل القدر صحابیہ ہیں، کئی عظیم صحابہؓ کی نکاح اور زوجیت اور صالح صحبت میں رہی ہیں نسب نامہ یہ ہے: ام کلثوم بنت عقبہ بن ابی معیط بن عمرو بن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی۔

باپ کا نام عقبہ بن ابی معیط، ماں کا نام ''اروی بنت کریز'' تھا، حضرت عثمان ذوالنورینؓ ان کے اخیافی بھائی تھے یعنی دونوں کی ماں ایک تھی۔ باپ عقبہ بن معیط اسلام کا سخت دشمن تھا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پشت مبارک پر ابوجہل کے کہنے پر حالتِ سجدہ میں اونٹ کی اوجھ لاکر ڈالا تھا، لیکن بیٹی کو اللہ نے شرف اسلام سے نوازا، خاندان کی ہزار مخالفت کی کوئی پروانہ کی، بڑے نامساعد حالات میں اسلام پر صبر واستقامت سے قائم ودائم رہیں، یہ مکہ میں مسلمان ہوئیں، شرفِ بیعت سے مشرف ہوئیں، سن سات ہجری تک یہ ہجرت کے لئے تیار نہ ہوسکیں، اس لئے کہ باپ اور بھائی کڑی نگاہ رکھتے تھے، کفر وشرک کے ماحول میں بڑی مشکل سے زندگی گذار رہی تھیں، ان کے باپ اور بھائی ہر دم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف دشنام طرازی اور زبان درازی کیا کرتے، حضرت ام کلثومؓ اپنے آقا ومولا کے حوالے سے یہ نازیبا کلمات سن کر دل پیسج کر رہ جاتی۔

(الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب: ام کلثوم: ۴/ ۱۹۵۳، دار الجیل، بیروت)

ارادہ تو تھا کہ کسی طرح اس ناپاک ماحول سے مدینہ کے پاک ماحول میں جا پہنچے، ایک دن بنی خزاعہ کا ایک شخص مدینہ جارہا تھا، یہ موقعہ پاکر اس کی معیت میں پاپیادہ ہی مدینہ کی جانب چل پڑیں اور دن ورات کے مشقتوں کے بعد آقا کی خدمت میں جا پہنچیں، گھر والوں کو ان کے فرار کی خبر ہوئی تو ان کے تعاقب میں ان کے دو بھائی ولید بن عقبہ اور عمارہ بن عقبہ نکلے، یہ صلح حدیبیہ کا زمانہ تھا، حضرت ام کلثومؓ مدینہ آئیں، حالاں کہ کفار مکہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مابین جو معاہدہ ہوا اس میں شرط یہ تھی کہ اگر قریش کا کوئی آدمی خود وہ مسلمان ہی کیوں نہ

* ادارہ علم وعرفان، حیدرآباد، واستاذ حدیث دار العلوم دیودرگ

ہو مدینہ آئے گا تو مسلمان اسے مکہ بھیج دیں گے، معاہدہ کے مطابق مدینہ پہنچ کر ان کے بھائی خدمت نبوی میں حاضر ہوئے ، کہنے لگے، محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! ہمارے شرط پوری کیجئے، تو ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے کہا: اے اللہ کے رسول! کیا آپ ہمیں کفار کی جانب لوٹا دیتے ہیں؟ جو مجھے بددین کہتے ہیں، مجھ سے صبر و تحمل نہیں ہوتا، اور عورتوں کی ضعف اور کمزوری کی حالت سے بھی آپ واقف ہیں، اسی وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خیال ہوا کہ معاہدہ کی شرط میں عورتوں کا ذکر نہ تھا، اسی موقع سے اللہ عزوجل کا یہ ارشاد مبارک نازل ہوا "یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا جَآءَكُمُ الْمُؤْمِنٰتُ مُهٰجِرٰتٍ فَامْتَحِنُوْهُنَّ ؕ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِیْمَانِهِنَّ ۚ فَاِنْ عَلِمْتُمُوْهُنَّ مُؤْمِنٰتٍ فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ اِلَى الْكُفَّارِ" (الممتحنۃ:۱۰) اے ایمان والو! جب تمہارے پاس مومن عورتیں ہجرت کر کے آئیں تو تم ان کا امتحان لو۔ اللہ ان کے ایمان کو اچھی طرح جانتا ہے، اگر تم کو معلوم ہو کہ وہ مسلمان ہیں تو ان کو کافروں کے حوالہ نہ کرو۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرات (ہجرت کر کے آنے والی خواتین) سے عہد لیتے ہوئے کہ: تم کو تمہارے گھروں سے اللہ اور اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت اور اسلام نے نکالا ہے، تم شوہر یا مال کے حصول کے لئے نہیں نکلی ہو، یہ عورتیں جب یہ کہہ لیتیں تو انہیں کفار کے یہاں نہیں لوٹایا جاتا۔

اس آیت کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کو واپس کرنے سے انکار کر دیا، حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا نے خدا کا شکر بجالایا اور ان کے بھائی لاچار و مجبور ہو کر مکہ واپس ہو گئے۔ **''فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم للولید و عمارۃ ابنی عقبۃ، قد نقض اللہ العھد فی النساء بما قد علمتماہ فانصرفا''**

(الطبقات الکبری لابن سعد: ازواج عبد الرحمن بن عوف: ۳/۹۴، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا مکہ میں کوئی شوہر نہیں تھا (یہ غیر شادی شدہ تھیں) اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے ان کا نکاح اپنے منہ بولے بیٹے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سے کروایا، ان کی غزوہ موتہ میں شہادت کے بعد حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آئیں، ان سے نباہ نہ ہو سکا اور طلاق کی نوبت آئی، پھر حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے نکاح ہوا، تو ان سے چار لڑکے ابراہیم، حمید، اسماعیل اور محمد تولد ہوئے، جب حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ کے عقد نکاح میں آئیں، حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے کوئی اولاد نہیں ہوئی، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ سے ایک لڑکی زینب اور حضرت عبد الرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ سے چار لڑکے ہوئے۔ (اسد الغابۃ: ام کلثوم بنت عقبۃ: ۷/۳۶۷، دار الکتب العلمیۃ، بیروت)

حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے کئی ایک احادیث بھی مروی ہیں، جن میں ایک حدیث ہے: فرماتی ہیں کہ

رسول اللہ ﷺ سے سورۃ الاخلاص کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ ﷺ نے فرمایا: ''ثلث القرآن او تعدلہ'' (تہائی یا اس کے برابر قرآن کے مثل ہے)۔

اور ان سے اور ایک روایت مروی ہے ''لیس بالکاذب من أصلح بین الناس فقال خیرا'' (جھوٹا وہ نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان اصلاح کے لئے درست بات کہے) (اسد الغابۃ: ام کلثوم بنت عقبۃ: ۳۷۶/۷)

وفات: حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کی وفات حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ہوئی، حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ کی وفات سن ۳۲ھ میں ہوئی۔

(بقیہ صفحہ ۴۶ سے)

حضرت مولانا کو اس ملک میں کردارکشی کا بھی سامنا کرنا پڑا اور اس میں آپ کو بڑے مشکل اور ناگوار حالات سے گذرنا پڑا، لوگ تو ایسے موقعوں پر بے قابو ہو جاتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ملک بھر میں ان کے لیے جلسے جلوس ہوں، ہنگامے ہوں اور لوگ سڑکوں پر نکل آئیں، لیکن حضرت نے اس کو پسند نہیں کیا اور ہر طرح کے جوش واشتعال اور ہنگامہ وشورش سے دور رہتے ہوئے ذمہ داروں کو متوجہ کیا۔

ملک وملت کے حالات ومسائل کے گہرے شعور اور مکمل واقفیت کے باوجود حضرت مولانا نے سرپرستی ورہنمائی کے فرائض کو ''بار امانت'' کے طور پر انجام دیا، لیکن عملی سیاست سے ہر لمحہ اپنے دامن کو پاک رکھا، اپنی بےلوث اور مخلصانہ رہنمائی وقیادت کی وجہ سے آپ حق گوئی وبے باکی کا نمونہ تھے، آپ ایک سچے محب وطن اور قوم وملک کے حقیقی ومخلص بہی خواہ تھے، آپ نے اس ملک سے کچھ لینے کے بجائے ہمیشہ دینے کی راہ اختیار کی، بلاشبہ آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے بالخصوص اور پورے ملک کے لیے بالعموم حضرت مولانا کی ذات گرامی ایک شجرۂ سایہ دار تھی، کتنے حسین تھے وہ لمحات جنھیں ان کے ساتھ گذرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔

تذکارِ صحابہؓ

عمِ رسول اکرم حضرت عباس بن عبدالمطلبؓ

مولانا عبدالرشید طلحہ نعمانی قاسمی*

حضرت ابوالفضل عبّاس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے حسب نسب کے حوالے سے اتنا ہی لکھ دینا کافی ہے کہ وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معزز چچا تھے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد ماجد حضرت عبداللہ بن عبدالمطلب حضرت عباسؓ کے علّاتی بھائی اوران سے عمر میں تقریباً بائیس سال بڑے تھے۔حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت سے کچھ مدت پہلے انہوں نے وفات پائی تواس وقت حضرت عباسؓ کی عمر ڈھائی تین برس تھی،اس طرح حضرت عباسؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تقریباً تین برس پہلے پیدا ہوئے۔حضرت عباسؓ کی والدہ کا نام نتیلہ بنتِ جناب تھا۔وہ قبیلہ النّمر سے تعلق رکھتی تھیں۔اُسدُ الغابہ میں لکھا ہے کہ عہدِ طفلی میں حضرت عباسؓ ایک مرتبہ گم ہو گئے تھے،ان کی والدہ نے نذر مانی کہ اگر میرا گم شدہ فرزند مل گیا تو خانہ کعبہ پر دیبا وحریر کا غلاف چڑھاؤں گی۔خوش قسمتی سے حضرت عباسؓ بالکل صحیح وسالم مل گئے۔چنانچہ ان کی والدہ نے بڑی دھوم دھام سے اپنی منّت پوری کی۔کہا جاتا ہے کہ وہ پہلی عرب خاتون ہیں جنہوں نے زمانۂ جاہلیت میں خانہ کعبہ پر دیبا و حریر کا غلاف چڑھایا۔

حضرت عباسؓ دورِ جاہلیت میں:

زمانۂ جاہلیت میں حضرت عباسؓ کا شمار قریش کے سربرآوردہ رؤسا میں ہوتا تھا۔آپؓ ایک کامیاب تاجر تھے۔ایک روایت میں ہے کہ آپ یمن اور بعض دوسرے علاقوں میں کپڑے کی تجارت کرتے تھے اور لوگوں کو سود پر روپیہ بھی قرض دیا کرتے تھے۔طائف میں آپ کا ایک باغ بھی تھا۔آپ اپنے سوتیلے بھائی جناب ابوطالب بن عبدالمطلب سے زیادہ خوش حال تھے۔ابن کثیرؒ کا بیان ہے کہ حضرت عباسؓ کو خانہ کعبہ کا انتظام وانصرام اور سقایہ کا عہدہ اپنے والد جناب عبدالمطلب سے ورثہ میں ملا تھا؛لیکن بعض دوسرے مؤرخین نے لکھا ہے کہ حاجیوں کو پانی پلانے اور کھانا کھلانے کا منصب انہیں جناب ابوطالب نے ایک قرض کی ادائی کے سلسلے میں تفویض کیا تھا۔الغرض حضرت عبدالمطلب کے بعد قریش نے حضرت عباسؓ میں علم،شجاعت،سخاوت،

---

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

سیادت، خاندانی نجابت، صلہ رحمی دیکھ کر انہیں بیت اللہ کا محافظ منتخب کیا۔

زمانۂ جاہلیت میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ ان افراد میں سے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ چنانچہ حضرت عباس جب سن شعور کو پہنچے تو علم الانساب، علم التاریخ، علم الادیان میں مہارت حاصل کی، چوں کہ عرب میں یہ علوم عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے، خصوصاً علم الانساب؛ کیوں کہ حضرت ابراہیم واسماعیل علیہما السلام ہی کے زمانے سے برابر یہ خبر چلی آرہی تھی کہ عرب میں نسل اسماعیل ہی سے نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پیدا ہوں گے، اس وجہ سے علم الانساب کا بہت خیال رکھا جاتا تھا۔

قبولِ اسلام:

سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعوتِ حق کا آغاز فرمایا تو جن سعید روحوں نے اس پر لبّیک کہنے میں سبقت کی ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی اہلیہ حضرت اُمّ الفضل رضی اللہ عنہا بنت حارث بھی تھیں، بعض روایات کے مطابق ام المومنین حضرت خدیجہ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کے بعد دوسری خاتون تھیں جو سعادت اندوزِ ایمان ہوئیں۔ خود حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے کھلم کھلا قبولِ اسلام کا اظہار تو نہ کیا؛ لیکن مشرکینِ قریش کے مقابلے میں انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حفاظت اور معاونت میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا۔ معتبر روایات کی رو سے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے فتح مکہ سے کچھ عرصہ پہلے اپنے اسلام کا اعلان کیا اور اسی موقع پر ہجرت الی المدینہ کا شرف بھی حاصل کیا؛ مگر بعض اربابِ سِیَر نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ بعثتِ نبوی کے اوائل ہی میں ایمان لا چکے تھے؛ لیکن کسی مصلحت کے پیش نظر انہوں نے اپنے اسلام کو مخفی رکھا اور ظاہری طور پر مشرکین سے ہمیشہ کے معمول کے مطابق ملتے جُلتے رہے۔ بیعت عقبہ کے کچھ ہی عرصے بعد نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ چھوڑ کر مدینہ طیبہ ہجرت کر گئے۔ اور ہجرت کے دوسرے ہی سال بدر کا فیصلہ کن معرکہ پیش آیا۔ چوں کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ ابھی باضابطہ دامن اسلام سے وابستہ نہیں ہوئے تھے؛ اس لیے مشرکین مکہ کے حد درجہ مجبور کرنے کے سبب مسلمانوں کے خلاف جنگ میں شریک رہے۔ ادھر نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حقیقت حال سے واقف تھے؛ اس لیے آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: بعض لوگ زبردستی ہمارے مقابلے میں کھینچ کر لائے گئے ہیں، وہ ہم سے قطعاً لڑنا نہیں چاہتے، لہٰذا اثنائے جنگ ان کا سامنا ہو جائے تو انہیں قتل مت کرنا۔ الغرض جنگ ہوئی اور گھمسان کی جنگ ہوئی؛ جس میں مشرکین کو عبرت ناک شکست سے دو چار ہونا پڑا، ستر افراد قتل ہوئے اور ستر قیدی بنائے گئے، قیدیوں میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے جو بعد میں فدیہ دے کر آزاد ہو گئے۔

ابن الاثیر نے اسد الغابہ میں لکھا ہے کہ غزوۂ بدر کے بعد حضرت عباس ؓ نے کئی بار حضور سے ہجرت کی اجازت طلب کی؛ لیکن آپ نے منع فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ ابھی آپ کا مکہ میں قیام ہی زیادہ مناسب ہے۔ اللہ نے جس طرح مجھ پر نبوت ختم کی، اسی طرح آپ پر ہجرت ختم کرے گا۔

سن آٹھ ہجری میں فتح مکہ سے کچھ عرصہ قبل حضرت عباس ؓ نے برملا اپنے اسلام کا اعلان کر دیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انہیں ہجرت کی اجازت بھی مرحمت فرما دی۔ چناں چہ وہ اپنے اہل وعیال کے ساتھ مدینہ طیبہ تشریف لائے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی پذیرائی فرمائی اور ان کے لیے مستقل سکونت کا انتظام کیا۔

حضرت عباس ؓ اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان انس ومحبت:

حضرت عباس ؓ قبول اسلام سے قبل بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا بہت خیال رکھتے تھے؛ لیکن اسلام قبول کرنے کے بعد تو حضور ہی آپ کی محبت وعقیدت کا قبلہ بن گئے، رشتے اور عمر میں بزرگ ہونے کے باوجود نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا غیر معمولی احترام کرتے اور آپ کو اپنا آقا ومولا تسلیم کرتے تھے۔

حضرت مغیرہ بن ابی رزین رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہما سے پوچھا گیا: عمر میں کون بڑا ہے آپ یا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم؟ تو انہوں نے فرمایا: حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجھ سے بڑے ہیں اور میں تو (صرف) پیدا ان سے پہلے ہوا ہوں۔ (مستدرک حاکم)

حضرت عباس بن عبدالمطلب ؓ سے مروی ہے کہ میں نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا: ''یارسول اللہ! جب قریش آپس میں ملتے ہیں تو حسین مسکراتے چہروں سے ملتے ہیں اور جب ہم سے ملتے ہیں تو ایسے چہروں سے ملتے ہیں جنہیں ہم نہیں جانتے (یعنی بیزاری کا اظہار کرتے ہیں) حضرت عباس ؓ فرماتے ہیں: نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سن کر شدید جلال میں آ گئے اور ارشاد فرمایا: اس ذات کی قسم! جس کے قبضہ قدرت میں میری جان ہے کسی بھی شخص کے دل میں اس وقت تک ایمان داخل نہیں ہو سکتا جب تک اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور میری قرابت کی خاطر آپ سے محبت نہ کرے''۔ (سنن نسائی)

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ فرماتے ہیں کہ: ''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت عباس ؓ کا احترام ایسے کیا کرتے تھے جیسے کوئی بیٹا اپنے باپ کا احترام کرتا ہے۔ نیز نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے ساتھ یہ خصوصی معاملہ اس لیے کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو لوگوں میں خاص کیا تھا''۔ (اتحاف المهرة)

حضرت ابو رافع ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عباس ؓ سے ارشاد فرمایا: ''اے ابو الفضل آپ کو اللہ تعالیٰ کی اتنی رحمتیں ملیں گی حتیٰ کہ آپ راضی ہو جائیں گے''۔ (مستدرک حاکم)

حضرت عباسؓ عہدِ نبوی کے بعد:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک دور گذر جانے کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں بھی حضرت عباسؓ کو اسی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا، خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کی بہت زیادہ تعظیم وتکریم کیا کرتے تھے، ان کے بعد خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بھی یہی کیفیت رہی، حتیٰ کہ اگر راستے میں کہیں آتے جاتے انہیں حضرت عباسؓ نظر آجاتے تو وہ ان کے احترام میں اپنی سواری سے نیچے اتر آتے اور پیدل چلنے لگتے اور یوں کہا کرتے: ھٰذا عمّ النّبی ﷺ۔ یعنی ''یہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا محترم ہیں'' مقصد یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا محترم اگر پیدل چل رہے ہیں، ایسے میں میں سواری پر ان کے قریب سے گذروں یہ مناسب نہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں مشکل مواقع پر خود بکثرت دعا و مناجات کے علاوہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے بھی دعا کروایا کرتے تھے، چنانچہ ایک بار جب سخت قحط پڑا، تب انہوں نے حضرت عباسؓ سے دعا کے لیے کہا، جس پر حضرت عباسؓ نے خوب گڑگڑا کر اور نہایت دل سوزی کے ساتھ دعا کی، اور پھر دعا سے فراغت کے بعد جب مڑ کر حضرت عمرؓ کی جانب دیکھا تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی اور تب دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے بھی خوب بارش برسنے لگی، جس طرح ایک طرف حضرت عباسؓ کی آنکھوں سے لگاتار آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی، بعینہٖ اسی طرح اب دوسری طرف آسمان سے بھی خوب پانی برسنے اور بہنے لگا تھا، حالانکہ اس سے قبل وہاں مطلع بالکل صاف تھا، بارش کے قطعاً کوئی آثار نہیں تھے، بادلوں کا کوئی نام ونشان تک نہیں تھا۔ (ملخص از اصحاب الرسول:282)

ایک ایمان افروز واقعہ:

فتح مکہ کے بعد جب حضرت عباسؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مدینہ منورہ چلے آئے تو مسجد نبوی کے پاس حضرت عباسؓ کا گھر بنایا گیا، حضرت عباسؓ کے مکان کا پرنالہ مسجد نبوی کے صحن کی طرف تھا جس کو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نصب کرایا تھا جب حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانہ میں ارادہ کیا کہ حضرت عباسؓ کی وہ جگہ جو مسجد کے ساتھ ہی ہے اس کو بھی مسجد نبوی میں داخل کیا جائے اور اسی خیال سے انہوں نے حضرت عباسؓ کے پرنالہ کو جو مسجد میں گرتا تھا ان کی اجازت کے بغیر نکال ڈالا تو حضرت عباسؓ کو اس سے رنج اور صدمہ پہنچا۔ اس تنازع کے حل کے لئے حضرت ابی بن کعبؓ کو فیصل مقرر کیا گیا حضرت ابی بن کعبؓ نے دونوں کو اپنے مکان پر بلوایا حضرت عباسؓ نے کہا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے میرے لئے ایک خط کھینچا تھا، وہیں میں نے اپنا

مکان بنایا اور وہ پرنالہ جس کو عمرؓ نے توڑ ڈالا ہے، یہ وہ پرنالہ ہے جس کو میں نے سرکار دو عالم ﷺ کے مبارک کندھوں پر کھڑے ہو کر قائم کیا تھا اب حضرت عمرؓ نے اس کو گرا دیا ہے اور میرے مکان کو مسجد میں داخل کرنا چاہتے ہیں۔ حضرت ابی بن کعبؓ نے کہا مجھ کو اسی طرح کا ایک واقعہ معلوم ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا حضرت داؤد علیہ السلام نے جب بیت المقدس بنانے کا ارادہ فرمایا تو اس جگہ دو یتیموں کا گھر تھا حضرت داؤد علیہ السلام نے وہ گھر خریدنا چاہا؛ مگر دونوں نے بیچنے سے انکار کر دیا بالآخران پر دباؤ ڈالا گیا اور زیادہ قیمت کا لالچ دیا گیا تو لڑکے راضی ہو گئے؛ مگر وہ اس قدر زیادہ مانگتے تھے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کوئی حتمی فیصلہ نہ کر سکتے تھے، آخر اللہ تعالیٰ نے وحی بھیجی کہ جو قیمت تم ان کو دیتے ہو اگر وہ ایسی چیز ہے کہ تم اس کا مالک اپنے آپ کو سمجھ رہے ہو تو خیر تمہاری مرضی، اور اگر وہ قیمت ہمارے دیئے ہوئے رزق میں سے ہے تو ان کو اس قدر دو کہ وہ راضی ہو جائیں تا کہ جو ہمارے نام کا گھر ہے وہ ہر قسم کے تشدد، ظلم جبر اور ناانصافی سے بالاتر ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ تقریر سن کر کہا کوئی اور بھی ہے جو یہ بتلائے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی ارشاد فرمایا تھا جیسا کہ ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا، ابی بن کعب رضی اللہ عنہ نے انصار کی ایک جماعت کو بلوایا اور جب انہوں نے تصدیق کی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے کہا خدا کی قسم تمہارا پرنالہ جس مقام سے میں نے گرایا تھا اسی جگہ قائم کروں گا اور اس طرح کہ تمہارے دونوں قدم میرے کاندھوں پر ہوں گے چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرے عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کاندھوں پر چڑھ کر اس پرنالہ کو بدستور اپنی جگہ قائم کیا، پرنالہ جب قائم ہو گیا تو حضرت عباسؓ نے فرمایا چوں کہ ثابت ہو چکا ہے کہ پرنالہ میرا ہی ہے اس لئے اب میں اپنی خوشی سے نہ صرف پرنالہ دوبارہ گرا دیتا ہو؛ بلکہ سارا مکان بھی اللہ تعالیٰ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں، اس اجازت کے بعد حضرت عمرؓ نے اس مکان کو مسجد نبوی میں داخل کر لیا اور آپؓ کو اس کے بدلے مقام زوراء پہ ایک وسیع وعریض مکان دیا"۔ (سیرت عباسؓ بہ حوالہ وفاء الوفاء)

وفات:

آپؓ کا وصال 12 / رجب المرجب 32ھ، مطابق 18 فروری 653ء، بروز جمعۃ المبارک 88 سال کی عمر میں ہوا۔ حضرت عثمان بن عفانؓ نے نماز جنازہ پڑھائی، حضرت علی کرم اللہ وجہ الکریم نے قبر میں اتارا اس طرح آپ جنت البقیع میں ہمیشہ کے لیے آسودۂ خاک ہو گئے۔ رضی اللہ عنہ وارضاہ

اصلاحی مضامین

نیا تعلیمی سال اور طلبہ کرام سے کچھ باتیں

تحریر: مفتی محمد راشد ڈسکوی

شوال المکرم کے مبارک مہینے سے دینی مدارس کی دو ماہ سے جاری ویرانی اور بے آبادی دور ہو کر دوبارہ رونقیں لوٹ آتی ہیں، علوم دینیہ کے حصول کے جذبات سے سرشار طلبہ کرام میل ہا میل کے سفر کی صعوبتوں کو طے کرتے ہوئے، مشفق، والدین اور اعزہ واقرباء کی جدائی کو برداشت کرتے ہوئے، اپنے وطن میں گزرنے والے شب وروز کی سہولتوں کو ترک کر کے پردیس کی مشکلات تک کو برداشت کرنے کی نیت سے مدارس کو اپنا وطن بناتے ہیں، اپنے اساتذہ کو اپنے والدین کا قائم مقام تصور کر کے، اپنے طلبہ ساتھیوں کو اپنے بھائیوں کا درجہ دیتے ہوئے سالہا سال کا سفر طے کرتے ہیں۔

قربانیوں کے اعتبار سے امتِ مسلمہ کے اس طبقے کو دیکھا جائے تو یقیناً ان کی قربانیاں بے مثال ہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اُن اَفراد کی قربانیوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا جن کو چھوڑ کر یہ طبقہ آیا ہوتا ہے۔

اِس لئے خیال ہوا کہ عزیز طلبہ کی دورانیہ تعلیم میں کرنے والے چند اہم اور ضروری کاموں کی طرف راہنمائی کر دی جائے، شاید کہ کسی طالبِ علم کے دل میں کوئی بات اُتر جائے اور اُس کی قربانیاں ٹھکانے لگ جائیں اور اُس کی زندگی سنورنے کا ذریعہ بن جائے، اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لما تحبُّ وَتَرْضیٰ

پہلا کام: تصحیحِ نیت

علم کی افادیت کا تعلق نیت کے صحیح ہونے یا صحیح نہ ہونے سے ہے، اگر حصولِ علم سے مقصود خدانخواستہ دنیا، حبِ جاہ ہوئی تو یہ نیت اُس طالبِ علم کو اسی دنیا میں دنیا والوں کے سامنے ذلیل کروائے گی اور آخرت میں تو ایسے شخص کو سب سے پہلے جہنم میں اوندھے منہ پھینک دیا جائے گا، یہ علم اُس کے لیے وبالِ جان بن جائے گا، اعاذنا اللہ منہ۔ یہ بات حدیثِ پاک میں مذکور ہے: "رجلٌ تَعَلَّمَ الْعِلْمَ وعلَّمَهُ وقَرَأَ الْقُرآنَ، فأُتِيَ بِه، فَعَرَّفَهُ نِعَمَه، فَعَرَفَهَا، قال: فَمَا عَمِلْتَ فِيْهَا؟ قَال: تَعَلَّمْتُ الْعِلْمَ وعَلَّمْتُه، وَقَرَأْتُ فِيْکَ

الْقُرْآنَ، قَالَ: كَذَبْتَ وَلٰكِنَّكَ تَعَلَّمْتَ الْعِلْمَ لِيُقَالَ إِنَّكَ عَالِمٌ، فَقَدْ قِيلَ، ثُمَّ أُمِرَ بِهٖ، فَسُحِبَ عَلٰى وَجْهِهٖ حَتّٰى أُلْقِيَ فِي النَّارِ"۔(صحیح مسلم)

ایک دوسری جگہ ارشاد فرمایا: علم کو علماء پر بڑائی جتانے، ناسمجھ عوام سے الجھنے اور مجلسیں جمانے کے لیے حاصل نہ کرو، جو شخص ایسا کرے گا، اس کے لیے آگ ہے آگ۔ قال (ﷺ): لا تعلَّمُوا العلمَ لِتُبَاهُوْا به العلَماءَ، ولا تماروا به السُّفهاءَ، ولا تخيرُوْا به المجالِسَ، فمَن فَعَل ذٰلک، فالنَّارُ فالنَّارُ"

(سنن ابن ماجہ، باب الانتفاع بالعلم والعمل بہ، رقم الحدیث: ۲۵۴)

بلکہ نیت یہ ہونی چاہیے کہ اس علم کے ذریعے پوری دنیا میں دینِ اسلام کو زندہ کروں گا، اس نیت کے کرنے والے کو اسی حالت میں موت بھی آ گئی تو اللہ تعالیٰ اس طالبِ علم کا حشر اس طرح فرمائیں گے کہ اُس کے اور انبیاء علیہم الصلوات والتسلیمات کے درمیان صرف ایک درجہ کا فرق ہوگا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشادِ مبارک ہے: "مَنْ جَاءَهُ الموتُ، وهُو يطلُبُ العِلمَ لِيُحيِيَ به الإسلامَ، فبَينَه وبينَ الأنبياءِ في الجنةِ درَجَةٌ واحِدَةٌ" (جامع بیان العلم وفضلہ، باب جامع فی فضل العلم، رقم الحدیث: ۲۱۹، دار ابن الجوزی)

چناں چہ سب سے پہلا کام اپنی نیت کو ٹٹولنا اور اس کو صحیح کرنا ہے اور یہ کام بار بار کرنا ہوگا، جب بھی اپنی نیت کو بگڑا ہوا پائے اسی وقت اپنی نیت کی تصحیح کی جائے۔ ایک بات سامنے رہے، اس پہلی بات میں جو عرض کیا جا رہا ہے، وہ ہے تصحیح نیت، اس کا مقتضیٰ یہ ہے کہ اگر حصولِ علم کے وقت نیت ٹھیک نہ ہو تو اس حصولِ علم کو ترک نہیں کرنا چاہیے؛ بلکہ اپنی نیت کو درست کر لینا چاہیے، اور جب تک نیت درست نہ ہو، محض نیت درست نہ ہونے کی وجہ سے ترکِ علم صحیح نہیں؛ کیوں کہ بزرگوں کا مقولہ ہے: "تَعَلَّمْنَا الْعِلْمَ لِغَيْرِ اللهِ، فَأَبَى الْعِلْمُ إِلَّا أَنْ يَكُوْنَ لِلّٰهِ" (کہ ہم نے علم غیر اللہ کے لیے پڑھا تھا، مگر وہ مانا ہی نہیں، لہٰذا وہ اللہ کا ہو کر ہی رہا) اس لیے علم کے حاصل کرنے کو ترک نہ کرے؛ بلکہ اپنی نیت درست کر لے۔

دوسرا کام: علمی استعداد مضبوط کرنا

تصحیحِ نیت کے بعد جو اہم ترین کام ہے، وہ اپنی علمی استعداد کو مضبوط سے مضبوط کرنا ہے، اس کے لیے پہلے دن سے ہی اپنی کمر کسنا ہوگی، مدارسِ دینیہ میں جتنے بھی علوم پڑھائے جاتے ہیں، اُن میں اپنے آپ کو اتنا ماہر اور مضبوط بنانا ضروری ہے کہ علوم کا کوئی بھی شعبہ ہو (صرف ونحو ہو یا منطق وعلمِ کلام ہو یا فلسفہ وبلاغت، اصول فقہ ہو یا فقہ، اصول حدیث ہو یا حدیث، اصول تفسیر ہو یا تفسیر) کسی شخص کے سامنے ان علوم میں آپ کی کمزوری نہ آ سکے، اور ان علوم میں لغزش کھانے والے کوئی بھی اہلِ علم آپ کی نظر سے بچ کے نہ گزر سکے، اس

استعداد کے حصول کے لیے اگر حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی صاحب رحمہ اللہ کا ملفوظ سامنے رکھ لیا جائے تو انشاء اللہ وہ ہی کافی ہو جائے گا، حضرت فرمایا کرتے تھے، جو طالبِ علم تین کام کر لے، اللہ تعالیٰ اسے ضرور علم کی دولت سے نواز دیں گے: مطالعہ، سبق میں توجہ سے حاضری اور تکرار۔ ان تینوں کاموں کو بہر صورت انجام دینا حصولِ علم کی کامیابی کی کنجی ہے، اِن تینوں کاموں کے بارے میں اجمالاً یہ عرض کرنا ہے کہ "مطالعہ" نام ہے، معلومات کو مجہولات سے الگ کر دینے کا، یعنی: جب آپ سبق میں شریک ہونے سے پہلے کتاب کھول کے مطلوبہ سبق کا مطالعہ کریں، اُس سبق کو صرفی نحوی اور لغوی اعتبار سے حل کریں، اُس کے ترجمے، ترکیب اور مفہوم کے سمجھنے کی کوشش کریں، اس کوشش میں جو جو کامیابی آپ کو حاصل ہو جائے، وہ "معلومات" کہلائیں گی، اور جو بات سمجھ میں نہ آسکے، اسے "مجہولات" کا نام دیا جائے گا، "مجہولات" آپ کے ذہن میں مستحضر ہونی ضروری ہیں؛ تاکہ کسی دوسرے وقت، کسی دوسرے ساتھی یا استاذ سے یا سبق میں انھیں خاص طور پر حل کیا جا سکے، مطالعہ کی اتنی کوشش انشاء اللہ آپ کو آگے سے آگے لے جانے کا ذریعہ بنے گی۔ اس کے بعد "سبق میں حاضری" کا مرحلہ ہے، اس مرحلے میں بھرپور کوشش یہ ہونا ضروری ہے کہ آپ سے نہ تو کوئی سبق چھوٹنے پائے اور نہ ہی کسی سبق میں بے توجہی اور غفلت سے شریک ہوں؛ بلکہ سبق کی ابتداء سے انتہاء تک پوری بیدار مغزی سے شرکت ضروری ہے، اس کوشش میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ دورانِ سبق استاذ کی زبان سے جو بات بھی نکلے اُس بات کے علاوہ کوئی بات آپ کے کانوں میں داخل نہ ہو، اسی طرح آپ کی آنکھ استاذ سے ہٹ کر کسی اور طرف مشغول ہونے والی نہ ہو، نیز! دل و دماغ پوری طرح سبق میں ہی حاضر رہیں، سبق میں سامنے آنے والی باتوں کو ذہن میں محفوظ کرنے کی کوشش کی جائے، اور سبق کے بعد انھیں کاغذ پر محفوظ کر لیا جائے۔

اس کے بعد آخری مرحلہ "تکرار" کا ہے، سبق میں سنی ہوئی باتوں کے دُہرانے کو "تکرار" کہتے ہیں۔ اس مرحلے میں مطالعہ اور سبق میں رہ جانے والی کسریں نکل جاتی ہیں، تکرار کا عمل جتنے بھرپور طریقے سے مکمل ہوگا، آپ کی سبق پر گرفت اتنی ہی زیادہ ہوگی، بزرگوں کا مقولہ ہے کہ جو طالبِ علم جتنا زیادہ تکرار کا ماہر ہوگا، وہ اتنا ہی بہترین مدرس بن سکے گا۔ تکرار کے بارے میں تجربہ یہ ہے کہ تکرار میں بولنے والے کو جو فائدہ حاصل ہوتا ہے، وہ سننے والے کو نہیں ہوتا؛ اس لیے زیادہ بہتر یہ ہے کہ تکرار کی جوڑی دو افراد کی ہو، پہلے ایک بولے پھر دوسرا، اگر دو سے زیادہ ہوں، تو وقت کی قلت کے باعث ایک ہی بول سکے گا باقی صرف سننے والے ہوں گے، ان کے اندر اس مرحلے میں کمال حاصل کرنا ممکن نہ ہو سکے گا۔ یہ تینوں مرحلوں کا اجمالی خاکہ تھا، ان کی طرف مزید راہنمائی متعلقہ اساتذہ سے حاصل کر کے قدم اٹھایا جائے۔

تیسرا کام: خوشخطی اور عمدہ تحریر

خوشخطی اور عمدہ تحریر کے ذریعے ایک عالمِ دین بہتر سے بہتر انداز میں دین کی خدمت کرسکتا ہے اور سامنے والے پر اچھا اثر ڈال سکتا ہے، اس صفت میں ملکہ حاصل کرنے کے لیے بھی پہلے دن سے ہی محنت کرنا ضروری ہے، اگر ممکن ہو سکے تو کسی ماہر کاتب سے باقاعدہ وقت لے کر مشق کرے، اس کے لیے سب سے پہلے حروف تہجی کی صورتوں کو قواعد کے مطابق ذہن میں محفوظ کرے، اس کے بعد مرکبات کی مشق کرے، بالخصوص تین حروف تک کے مرکبات کی پہچان ضرور کر لی جائے، یعنی: کسی بھی حرف کے استعمال کی تین صورتیں تو یقینی ہیں: وہ حرف شروع میں ہوگا، درمیان میں ہوگا، یا آخر میں آئے گا، اِن تینوں حالتوں میں اُس کی شکل اور بناوٹ کیا ہوگی، اس کو سیکھ کر مشق کرے، اس بارے میں ایک مفید صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ جہاں کہیں بھی کسی کاتب کا لکھا ہوا کوئی لفظ دیکھیں اُس کی بناوٹ کو ذہن میں محفوظ کرلیں اور بعد میں اس کی نقل اُتارنے کی کوشش کریں، اس طریقے سے بہت جلد آپ کی خوشخطی میں نکھار آتا چلا جائے گا۔

چوتھا کام: خطابت

اپنی بات دوسروں کے سامنے رکھنے کے لیے، دوسروں کو دین کی طرف راغب کرنے کے لیے سب سے موثر ذریعہ زبان ہے، گفتگو کے فن اور خطابت کے اسرار ورموز سیکھے بغیر معاشرے میں پیدا ہونے والے سیکڑوں برائیوں کا سدباب آسانی سے ممکن نہیں ہے، ایک اچھا خطیب اور مقرر اپنے زورِ بیان کے ساتھ بے حس قوموں میں حِس پیدا کرتا ہے، سوئی ہوئی اقوام کو بیدار کرتا ہے، بگڑے ہوئے اَخلاق کو سنوار سکتا ہے۔

اور یہ بدیہی بات ہے کہ ہر انسان میں قدرت کی طرف سے کچھ نہ کچھ قوتِ بیان عطا کی گئی ہوتی ہے، اب انسان کا کام ہے کہ وہ اپنی اس استعداد کو مسلسل مشق کرتے ہوئے درجۂ کمال تک پہنچائے، اس مشق کے لیے ضروری ہے کہ ماہرین کے اندازِ بیان کو خوب اچھی طرح پرکھا جائے اور خوب مشق کی جائے، اپنی بات میں وزن، قوت اور اثر پیدا کرنے کے لیے سب سے پہلے اپنی زبان کو سہل اور آسان کرنا ہوگا، یعنی: اپنی گفتگو میں آسان سے آسان تعبیرات، الفاظ اور اُسلوب اپنانا ہوگا، اس سے آہستہ آہستہ چہرے کے تأثرات، آواز کے اُتار چڑھاؤ اور جسم کی حرکات وسکنات پر کنٹرول حاصل ہوگا، الغرض چہرہ، آواز اور ہاتھوں کے مناسب اشارے ہماری بات میں قوت، تاثیر اور تفہیم پیدا کرتے چلے جائیں گے۔

پانچواں کام: غیر نصابی مطالعہ

درسِ نظامی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ اپنی دینیات کے مطالعہ کو وسیع کرنا بھی ہماری ضرورت ہے، دینی

مطالعہ کے ساتھ خارجی حالات سے تازہ ترین واقفیت بھی ہونی چاہیے؛ تاکہ اعتماد کے ساتھ پختہ اور معتمد دینی معلومات رکھتے ہوئے عوام کا سامنا کرسکیں، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے ہماری نصابی تعلیم متأثر نہ ہونے پائے، دوسری بات یہ کہ مضر کتب کا مطالعہ نہ ہو، اس کا حل یہ ہے کہ یہ مطالعہ اپنے اساتذہ کی نگرانی میں ہو، ان کے مشورے سے، درجہ وار، اَلاَہَمّ فَالْاَہَمّ کے قاعدے کے مطابق تدریجاً ہو، اور سب سے اہم بات یہ کہ فرصت کے اوقات میں ہو، نہ کہ تعلیمی اوقات میں۔

چھٹا کام: تجوید وحفظ القرآن

وہ طلبہ جو حافظِ قرآن نہیں ہوتے، انھیں عام طور پر دو تین مشکلات میں مبتلا دیکھا گیا ہے، ایک تو قرآنِ کریم حفظ نہ ہونے کی وجہ سے بہت سے مقامات پر دشواری ہوتی ہے، نماز پڑھاتے وقت بالخصوص نمازِ فجر پڑھاتے وقت بہت دشواری محسوس کرتے ہیں، ان کی قرأت تجوید کے قواعد کو پورا کرنے سے قاصر نظر آتی ہے، اسی طرح ان کے بیانات اور تقاریر کے درمیان بھی قرآن پاک کی آیات کا برمحل استعمال بھرپور اعتماد سے نہیں کرپاتے، اس لیے طلبہ سے یہ بھی گزارش ہے کہ اپنی اس کمی کو پورا کرنے کی ابتدا سے ہی فکر کریں، کچھ نہ کچھ قرآنِ پاک روزانہ یاد کرتے رہیں، کم ازکم آخری دو تین پارے اور مشہور بڑی سورتیں تو یاد ہی کرلینی چاہییں، اور کسی ماہرفن قاری صاحب سے ضروری تجوید پڑھ کر اس کی مشق بھی کرلی جائے، اس ضمن میں خطباتِ جمعہ وعیدین اور خطباتِ نکاح بھی یاد کیے جائیں۔

ساتویں بات: غیر تعلیمی سرگرمیاں

یہ بات ہمیشہ سامنے رکھنے کی ہے کہ ہم اپنے گھر بار کو جو چھوڑ کر آئے ہیں ہمارا مقصد علمِ دین حاصل کرنا ہے، لہٰذا ہمارے لیے ہر ایسی سرگرمی سے بچنا نہایت ضروری ہے جو ہماری تعلیم کے لیے نقصان دہ ہو، اس میں سرِفہرست امر یہ ہے کہ ہم اس زمانہ میں ہر طرح کی تنظیمی وابستگی سے اپنے آپ کو دور رکھیں، یہ وابستگیاں ہمارے تعلیمی پروگرام کے لیے زہرِ قاتل کی مانند ہیں، یہ زمانہ ہمارے لیے ایک ایک لمحے کے اعتبار سے نہایت قیمتی ہے؛ اس لیے اس دورانیے میں ہماری مشغولیت صرف اور صرف تعلیم کے ساتھ ہونی چاہیے، ہاں فراغت کے بعد ہمارے کرنے کے کاموں میں حسب مزاج جس کام کی طرف میلان ہو یا ضرورتِ زمانہ جس کی متقاضی ہو، اُسے اختیار کرلینا چاہیے اور ضرور اختیار کیا جائے؛ لیکن ابھی نہیں، ابھی تو اس تعلیم کے ساتھ عملی میدان میں تحریک پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

آٹھواں کام: اساتذۂ کرام اور طلبہ ساتھیوں کے حقوق

ایک اچھے اور با کردار طالبِ علم کے مقام کو حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ کے دل میں اپنے محسنین اساتذہ کرام کی محبت اور ادب غایت درجے کا ہو، اُن کی دل جوئی، خدمت اور اکرام کو اپنی سعادت سمجھیں، ان کا ادب، ان کی بات کو دھیان اور توجہ سے سنیں، اُن کی نصائح کو اپنی کامیابی کا راز سمجھ کر اپنائیں اور اُن کی خدمت کے کاموں کو تلاش کر کے پوری لگن کے ساتھ کریں، یہ سب اُمور ایک طالبِ علم کو بہت جلد ترقی کی منازل طے کروا دیتے ہیں؛ لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اِن سب اُمور کا انجام دینا بد نیتی، مجبوری یا کسی غرضِ فاسد کے لیے نہ ہو، کہ یہ نیت فوائد تو درکنار تباہی اور بربادی کی طرف لے جانے والی ہے۔

ایک دوسری چیز زمانہ تعلیم میں آپ کا اپنے طلبہ ساتھیوں کے ساتھ برتاؤ ہے، ایک مخصوص عرصے کے لیے آپ کو ایک اجتماعی ماحول میں رہنا ہے، اس ماحول میں ایک نشست آپ کی درس گاہ کے ساتھیوں کی ہے، دوسری نشست آپ کے کمرے کے ساتھیوں کی ہے، تیسری نشست عمومی طور پر پورے جامعہ کے ساتھیوں کی ہے، اِن تمام مراحل میں اگر آپ اپنے ساتھ یہ طے کرلیں گے کہ میں اپنے اِن تمام قسم کے ساتھیوں کے ہر قسم کے حقوق ادا کروں گا اور میری طرف سے کسی کو کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچے گی، میں کسی کی چیز بغیر اجازت استعمال نہیں کروں گا تو اللہ رب العزت آپ کی اِس مبارک صفت کی وجہ سے آپ کی عزت اور احترام آپ کے تمام طلبہ ساتھیوں کے دلوں میں ڈال دیں گے، بصورتِ دیگر! جہاں آپ بے اطمینانی اور بے سکونی کا شکار ہوں گے، وہاں ہر کوئی آپ سے اس طرح دور رہنے کی کوشش کرے گا، جیسے کوئی شخص کسی موذی جانور سے بچنے کی اور دور رہنے کی کوشش کرتا ہے، لوگ آپ کے شر سے بچنے کی خاطر آپ سے سلام دعا اور میل جول رکھیں گے؛ لیکن ان کے دل آپ کے بارے میں نفرتوں سے بھرے ہوں گے۔

ایک اچھا انسان بننے کے لیے آپ اپنے ساتھ یہ طے کرلیں کہ آپ جب بھی کسی سے ملیں تو اس طریقے اور ان اَخلاق سے ملیں کہ وہ آئندہ آپ سے ملنا پسند کرے، آپ کے پاس بیٹھنا پسند کرے، آپ کے ساتھ کچھ وقت گذارنا اپنی سعادت سمجھے تو انشاء اللہ آپ ہر دل عزیز شخصیت بنتے چلے جائیں گے۔

نواں کام: مدرسہ کے ضوابط اور قوانین

علم کی ترقی کے راستوں میں ایک ضروری چیز اس ادارے کے نظم ونسق اور اصول وضوابط کو پورا کرنا بھی ہے، یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ کوئی بھی ادارہ ہو، وہ بغیر اصول وضوابط کے نہیں چل سکتا اور یہ بات بھی بالکل بدیہی ہے کہ اصول وضوابط اجتماعی نظم کے درست رکھنے کے لیے ہوتے ہیں؛ اس لیے اپنے ادارے کے اصول

وضوابط کو پورا کرنا ہماری خوشگوار زندگی کا سبب بنے گا، اس سے ہمارے اندر نکھار پیدا ہوگا، ہماری زندگی ایک مرتب نظام کے مطابق سلجھی ہوئی گزرے گی، ہر کوئی ہم سے خوش ہوگا اور ہم سب سے خوش ہوں گے، مثلاً: اس کے لیے یہ اصول بنالیں کہ تعلیم کا وقت شروع ہوتے ہی درس گاہ میں پہنچ جانا ہے، کھانے کا وقت ہوتے ہی کھانے کے لیے چلے جانا ہے، سونے کا وقت ہوتے ہی سونے کے لیے لیٹ جانا ہے، درس گاہ ہو یا رہائشی کمرہ، اپنی باری پر خدمت اور صفائی کرنی ہے، تو یقین جانیے کہ مدرسہ کے کسی استاذ کو، حتی کہ مدرسہ کے کسی بھی کارکن کو آپ سے کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی، کوئی آپ سے تنگ نہیں ہوگا، نہ کسی کو آپ سے کسی قسم کی کوئی شکایت ہوگی اور نہ ہی آپ کو کسی کی طرف سے کسی قسم کی ناگواری کا سامنے کرنا پڑے گا۔

دسواں کام: تعلق مع اللہ اور اصلاحِ ظاہر و باطن

ایک انتہائی اہم بات یہ ہے کہ ہماری سالہا سال کی یہ محنت اس لیے ہے کہ ہم میں سو فیصد اللہ تعالیٰ کی اطاعت کرنے کی استعداد پیدا ہو جائے، لہٰذا عبادات کے ذریعے، مناجات کے ذریعے اور موقع ومحل کے مطابق اتباعِ رسول ...... کے ذریعے ہم لمحہ بہ لمحہ اللہ تعالیٰ کے قرب میں آگے بڑھ سکتے ہیں، آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی مسنون زندگی کا کوئی گوشہ ہم سے مخفی نہ ہو اور اسی طرح ہماری زندگی کا کوئی عمل سنتِ نبوی ...... کے خلاف نہیں ہونا چاہیے، یہ کوشش ہماری ہر کوشش سے زیادہ قیمتی اور ضروری ہے، اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی سامنے رہے، ہم اپنی مدرسہ اور مدرسہ سے باہر کی زندگی میں اپنی طرف سے عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق اور خدمتِ خلق کا ایسا نمونہ چھوڑیں کہ آپ کی مثال دے کر لوگ اپنے بچوں کی تربیت کریں، ہم اپنے مقام پر، اپنے گھروں میں، اپنے گلی محلوں میں، اپنے معاشرے میں اپنے آپ کو ایسا پیش کرنے کی کوشش کریں کہ ہمارے متعلقین واضح طور پر، کھلی آنکھوں ہمارے بارے میں یہ محسوس کریں کہ "ہمارا یہ عزیز" مدرسہ کی زندگی اختیار کرنے سے قبل، یا سابقہ سال میں تو (اپنی عبادات، اپنے معاملات، اپنی حسنِ معاشرت اور اپنے اخلاق میں) ترقی کے اس معیار پر نہیں تھا، جس معیار پر اب پہنچ چکا ہے۔ اس سے آپ انشاء اللہ العزیز ایک ایسے مثالی طالبِ علم بن جائیں گے کہ لوگ آپ کی صلاحیتوں کی وجہ سے آپ کو اپنے کندھوں پر بٹھائیں گے، آپ کا ادب کریں گے، آپ کی بات توجہ سے سنیں گے، آپ کے مشوروں پر عمل کریں گے، آپ کی خدمت کو اپنی سعادت سمجھیں گے، اپنے فیصلوں کے لیے آپ کو حَکَم بنانا تسلیم کریں گے، آپ کی مثالیں دے کر اپنی اولاد اور اپنے ماتحتوں کی تربیت کریں گے، آپ کو دیکھ کر اپنی اولاد کو بھی مدارس دینیہ میں داخل کروانے کا فیصلہ کریں گے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اللہ رب العزت دنیا وآخرت کی سعادتیں آپ کا مقدر بنادیں گے۔ آمین

اصلاحی مضامین

علماء اور وقت کی قدردانی

ازقلم: مولانا خالدسیف اللہ رحمانی مدظلہٗ*

وقت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت ہے، وقت کی قدرو قیمت کا اندازہ اس سے لگایئے کہ خوداللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں کتنے ہی مقامات پر وقت کی قسم کھائی ہے،کبھی رات اور صبح کی قسم کھائی گئی (لیل:۱-۲،مدثر:۳۳-۳۴ ،تکویر:۱۷-۲۸) کبھی رات کے ساتھ ’’شفق‘‘ کی قسم کھائی گئی (انشقاق:۱۶-۱۷)،کبھی فجر اور اس کے ساتھ دس راتوں کی (الفجر:۱-۲)،کبھی دن کی روشنی اور رات کے چھا جانے کی (الضحیٰ:۱-۲) اور کبھی خود زمانہ کی (العصر:۱) دنوں کی آمدورفت اور سورج و چاند کے طلوع وغروب سے اوقات کا علم ہوتا ہے،قرآن مجید نے جابجا اللہ کی نعمت کی حیثیت سے ان کا ذکر فرمایا ہے۔ اللہ تعالیٰ قیامت میں انسان سے اس کی عمر کے بارے میں بھی سوال فرمائیں گے کہ کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہیں دی تھی ،جس میں نصیحت حاصل کرنے والے لوگ نصیحت حاصل کرسکیں؟’’اَوَلَمۡ نُعَمِّرۡكُمۡ مَّا يَتَذَكَّرُ فِيۡهِ مَنۡ تَذَكَّرَ‘‘ (الفاطر:۳۷)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: کہ قیامت کے دن آدمی سے سوال کیا جائے گا کہ اس نے اپنی عمر کس کام میں گذاری اور اپنی جوانی کو کس مقصد میں صرف کیا؟ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے مروی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: دو نعمتیں ایسی ہیں جن کے بارے میں بہت سے لوگ دھوکہ میں مبتلا ہیں: صحت اور فراغتِ وقت۔

وقت کی قدردانی اور اس کا صحیح استعمال یوں تو ہر شخص کا فریضہ ہے؛لیکن علماء کو اس طرف خصوصی توجہ کی ضرورت ہے، افسوس کہ موجودہ دور میں نوجوان فضلاء اپنا ڈھیر سارا قیمتی وقت سوشل میڈیا پر اور نامنصفانہ وغیر مفید تنقید وتبصرہ میں گزار دیتے ہیں،نوجوانوں میں چوں کہ قوت عمل زیادہ ہوتی ہے، امنگ ہوتی ہے، کام کا جذبہ ہوتا ہے، اگر وہ سلامت طبع کے ساتھ اپنے اوقات کا صحیح استعمال کریں تو امت کے لئے متاع گراں مایہ ثابت ہوسکتے ہیں، پھر تو اُن کو شکایت کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی کہ ان کو کوئی مقام نہیں دیا جاتا، امت خود ان کو اپنے سروں کا تاج بنائے گی۔

---

*جنرل سکریٹری آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ

سلفِ صالحین جنھوں نے اعلیٰ درجہ اور بلند قیمت علمی کام کئے ہیں، اپنے وقت کے ایک ایک لمحہ کو وصول کرتے تھے اور ایک منٹ کا ضائع ہونا بھی ان کو گوارا نہیں تھا، وہ آخر دم تک اپنے وقت کو مشغول رکھتے تھے، امام ابو یوسفؒ (۱۱۳-۱۸۲ھ) اسلامی تاریخ کے پہلے قاضی القضاۃ ہیں، ان کے بارے میں اہل تذکرہ نے قاضی جراح سے نقل کیا ہے کہ وہ مرضِ وفات میں امام صاحبؒ کی عیادت کے لئے پہنچے، آپؒ پر بے ہوشی طاری تھی، ابراہیم بیٹھے رہے، کچھ دیر میں ہوش آیا، امام صاحبؒ نے پوچھا کہ حج میں جمرات کی رمی پیدل کرنا افضل ہے یا سواری پر؟ ابراہیم نے استاذ سے عرض کیا: اس حال میں بھی آپ فکر وتحقیق کو نہیں چھوڑتے، امام ابو یوسفؒ نے فرمایا: کوئی حرج نہیں، ابراہیم نے کہا: سوار ہو کر رمی کرنا افضل ہے، امام ابو یوسفؒ نے کہا: یہ غلط ہے، ابراہیم نے کہا: پھر پیدل رمی کرنا افضل ہوگا، فرمایا: یہ بھی غلط، ابراہیم نے عرض کیا: جو رائے صحیح ہو اسے آپ ہی ارشاد فرمائیں، فرمایا: جس رمی کے بعد کوئی اور رمی ہو، اس کو پیدل کرنا افضل ہے اور جس کے بعد اور کوئی رمی نہ ہو اسے سوار ہو کر، ابراہیم وہاں سے اٹھے اور امام صاحبؒ کے گھر کے دروازے ہی پر پہنچے تھے کہ اہل خانہ کے رونے کی آواز آئی، دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ امام ابو یوسفؒ کا انتقال ہوگیا ہے، یہی امام ابو یوسفؒ ہیں جن کے بارے میں منقول ہے کہ انھوں نے سترہ سال تک اپنے استاذ امام ابو حنیفہؒ کی مجلس میں اس طرح شرکت کی کہ کبھی فجر کی نماز فوت نہیں ہوئی، یہاں تک کہ عید الفطر اور عید الاضحیٰ کے دن بھی، بلکہ صاحبزادے کا انتقال ہوگیا تو تجہیز وتکفین کا انتظام اپنے اعزہ اور پڑوسیوں کے حوالہ کر کے درس میں شریک رہے اور درس سے محرومی کو گوارہ نہیں کیا۔ (مناقب مکی: ۱/ ۴۷۲)

ایک بڑے محدث عبید بن یعیشؒ گذرے ہیں، جو امام بخاریؒ اور امام مسلمؒ کے اساتذہ میں ہیں، ان سے حافظ ذہبیؒ نے نقل کیا ہے کہ تیس سال تک رات میں اپنے ہاتھ سے کھانا نہیں کھایا؛ بلکہ خود حدیث لکھنے میں مصروف رہتے اور بہن منہ میں لقمہ دیتی جاتیں۔ (سیر اعلام النبلاء: ۱۱/ ۴۵۸)

احمد بن یحییٰ شیبانی (۲۰۰-۲۹۱ھ) عربی لغت، ادب، گرامر اور قراءت وغیرہ کے بڑے نامی گرامی عالم تھے اور 'ثعلب' کے نام سے مشہور تھے، ان کا حال یہ تھا کہ اگر دعوت دی جاتی تو داعی سے فرماتے: کھانے کے وقت ان کے لئے چمڑے کے تکیہ کی مقدار جگہ خالی رکھی جائے، جس میں وہ کتاب رکھ کر مطالعہ کریں۔

(الحث علی طلب العلم الخ للعسکری: ۷۷)

امام ثعلبؒ کا معمول تھا کہ راستہ چلتے بھی ہاتھ میں کتاب رہتی اور مطالعہ کرتے جاتے؛ چنانچہ اسی طرح چل رہے تھے کہ گھوڑے نے ٹکر دی، گڑھے میں گر پڑے اور ایسی چوٹ آئی کہ دوسرے ہی دن وفات ہوگئی۔

(وفیات الاعیان لابن خلکان: ۱/ ۱۰۴) اسی کا نتیجہ ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں اہل علم نے اتنا عظیم تصنیفی اور تالیفی کام انجام دیا ہے کہ سن کر اور پڑھ کر حیرت ہوتی ہے اور آج ان کتابوں کو ایک شخص کا پڑھ لینا بھی دشوار ہے، امام ابن جریر طبریؒ بہت ہی بلند پایہ مفسر، محدث اور فقیہ ہیں، انھوں نے اپنی عظیم الشان تفسیر ۳/ ہزار اوراق میں ۲۸۳ تا ۲۹۰ھ یعنی صرف سات سال کے عرصہ میں مکمل کی، پھر ایک تفصیلی تاریخ لکھنی شروع کی، جس سے ۳۰۳ھ میں فارغ ہوئے، یہ دونوں کتابیں تین تین ہزار گویا چھ ہزار اوراق پر مشتمل ہیں، طبری کی یہ تفسیر ۱۱/ ضخیم جلدوں میں منظر عام پر آچکی ہے، بعض حضرات نے لکھا ہے کہ طبری کی تصنیفات کا حساب لگایا جائے تو یومیہ ۱۴/ ورق یعنی ۲۸/ صفحات کا اوسط ہوتا ہے۔

حافظ ذہبیؒ نے تذکرۃ الحفاظ میں لکھا ہے کہ انھوں نے جو روشنائی خریدی، اس کا حساب کیا گیا تو وہ سات سو درہم کی تھی، ابوریحان بیرونیؒ کی وفات کے وقت اس زمانہ کے مشہور فقیہ ابوالحسن ولوالجی گئے، بیرونیؒ نزع کی حالت میں تھے اور سینے میں گھٹن محسوس کر رہے تھے، اس وقت انھوں نے علامہ ولوالجی سے ''جداتِ فاسدہ'' (نانی) کے حق میراث کا مسئلہ پوچھا، ولوالجی کو رحم آیا اور کہنے لگے: اس وقت بھی آپ کو یہ فکر پڑی ہے؟ بیرونیؒ نے کہا کہ دنیا سے اس مسئلہ سے واقف ہو کر جانا بہتر ہے یا ناواقف رہ کر؟ والوالجی نے مسئلہ کی وضاحت کر دی اور واپس ہوئے، کچھ دور آئے تھے کہ رونے دھونے کی آواز آئی اور معلوم ہوا کہ علامہ بیرونیؒ کا انتقال ہو گیا ہے وقت کی حفاظت کرنے والے بزرگوں میں علامہ ابن عقیلؒ بھی ہیں، جو بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں، ان کی سب سے اہم کتاب ''الفنون'' ہے، جس کے بارے میں بعض دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس کی ۸/ سو جلدیں تھیں، اس کا کچھ حصہ ڈاکٹر جارج مقدسی مستشرق نے دو جلدوں میں ۱۹۷۰-۷۱ء میں شائع کیا ہے، امام ابن جوزیؒ تاریخ اسلام کے بڑے مصنفین میں ہیں، وہ ان لوگوں کو بہت ناپسند کرتے تھے جو چاہتے کہ ان کے پاس ملاقاتیوں اور ہم نشینوں کی بھیڑ لگی رہے، خود بھی بے مقصد آنے والوں سے بہت نالاں رہتے اور مجبوراً جن لوگوں سے ملاقات کرنی ہوتی، ان سے ملاقات کے اوقات کو اس طرح استعمال فرماتے کہ اس وقت حسبِ ضرورت کاغذ کاٹتے جاتے، قلم تراش لیتے اور لکھے ہوئے اوراق باندھ لیتے، اس کا نتیجہ تھا کہ بقولِ حافظ ابن رجبؒ شاید ہی کوئی فن ہو، جس میں ابن جوزیؒ کی کوئی کتاب نہ ہو، ابن جوزیؒ کی تصنیفات پانچ سو سے اوپر ہیں اور اُن میں سے بعض بیس جلدوں اور بعض دس جلدوں پر مشتمل ہیں، ابن جوزیؒ کے بارے میں نقل کیا گیا ہے کہ انھوں نے جن قلموں سے حدیثیں تحریر کی تھیں، ان کے ڈھیر سارے تراشے جمع ہو گئے تھے، انھوں نے وصیت فرمائی تھی کہ میرے مرنے کے بعد میرے غسل کا پانی اسی سے گرم کیا جائے؛ چنانچہ پانی گرم کرنے کے بعد بھی قلم کے

تراشے بچے رہے۔

مشہور مفسر اور صاحبِ نظر امام رازیؒ کھانے کے وقت پر بھی افسوس کا اظہار کرتے کہ اس وقت علمی مشغلہ فوت ہوجاتا ہے، مشہور محدث علامہ منذریؒ کے صاحبزادے رشید الدین (م: ۶۴۳) کا انتقال ہوگیا، جواُن کو بہت محبوب تھے تو اپنے جواں مرد بیٹے کی نمازِ جنازہ خود پڑھائی، مدرسہ کے دروازہ تک جنازہ کے ساتھ خود چلے اور وہاں سے اللہ کے حوالے کرکے اپنے معمولات میں مشغول ہوگئے۔

امام نوویؒ جیسے محدث اور صاحبِ علم سے کون ناواقف ہوگا، راستہ چلتے ہوئے بھی علمی مذاکرہ میں اپنا وقت گذارتے، صرف ۴۵ سال کی عمر پائی، لیکن ہزار ہاہزار صفحات ان کے قلم سے آج بھی محفوظ ہیں، جو اہل علم کے لئے حرزِ جاں ہیں، ابن النفیس میڈیکل سائنس کی یادگار شخصیتوں میں ہیں، جسم میں دورانِ خون کا نظام سب سے پہلے انھوں نے ہی دریافت کیا، طب میں آپ کی کتاب ''الشامل'' تقریباً ۳۰ جلدوں میں ہے۔

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہؒ کا حال یہ تھا کہ سفر وحضر اور صحت و بیماری کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہونے دیتے، ان کے شاگرد ابن قیمؒ نے ان کی تصنیفات کی تعداد پر جو رسالہ لکھا ہے وہ خود ۲۲ر صفحات کا ہے۔

اخیر دور کے اہل علم میں علامہ شوکانیؒ کا حال یہ تھا کہ روزانہ دس اسباق پڑھاتے، فتاویٰ بھی لکھتے، فریضۂ قضاء بھی انجام دیتے اور اس کے ساتھ ساتھ ۱۱۴ر اہم تصنیفات آپ کی یادگار ہیں۔

علامہ شہاب الدین آلوسیؒ (۱۲۱۷-۱۲۷۰) کا حال یہ تھا کہ روزانہ چوبیس اسباق پڑھاتے، افتاء کا کام بھی کرتے اور اس کے ساتھ انھوں نے ''روح المعانی'' کے نام سے ایسی عظیم الشان اور مبسوط تفسیر لکھی ہے، جس کی پورے عالم نے داد دی ہے۔

ہندوستان کے علماء میں مولانا عبدالحئی فرنگی محلیؒ نے صرف ۳۹ر سال کی عمر پائی؛ لیکن ان کی تصانیف ۱۱۰ر سے بھی زیادہ ہیں اور ہر کتاب گویا اپنے موضوع پر حرفِ آخر ہے، مولانا اشرف علی تھانویؒ کی کتابوں اور رسائل کی تعداد ہزار کے قریب ہے، مولانا عبدالحئی حسنیؒ نے ''الثقافة الاسلامية فی الهند'' مولانا حبیب الرحمٰن شیروانیؒ نے ''علماء سلف'' اور مشہور محقق شیخ عبدالفتاح ابوغدہؒ نے اپنی نہایت اہم اور فاضلانہ تصنیف ''قيمة الزمن عند العلماء'' میں سلفِ صالحین کے ایسے کتنے ہی واقعات نقل ہیں، یہ ہمارے لئے مایۂ عبرت اور مشعلِ راہ ہیں۔

اصلاحی مضامین

اجتماعی زندگی کے تقاضے

مفتی محمد ثناء الہدیٰ قاسمی*

انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ فرد کی سوچ اپنے خاندان سے آگے نہیں بڑھ پاتی وہ اپنی ذات میں جیتا ہے، اپنے بال بچوں کے بارے میں سوچتا ہے، اس کے غور وفکر کا دائرہ انتہائی محدود ہوتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں اچھا تو سب اچھا، اس کی منصوبہ بندی اور ترقیاتی کام بھی اسی دائرہ میں محدود ہوتا ہے، سماج میں اس قسم کے افراد کثرت سے پائے جاتے ہیں، جس کی وجہ سے خودغرضی عام ہو رہی ہے اور اپنا مفاد، اپنا بھلا سے بات آگے نہیں جاتی۔

اجتماعی زندگی میں انسان کی سوچ اپنی ذات، خاندان؛ بلکہ رشتہ داری سے نکل کر ملی، سماجی اور معاشرتی دائرے میں آگے بڑھتی ہے، اس کے غور وفکر کا دائرہ وسیع ہوتا ہے، اور وہ اپنا نقصان کر کے بھی ملک وملت کے مفاد کو آگے بڑھتا دیکھنا چاہتا ہے اور اس کی عملی حصہ داری اس میں ہوتی ہے، ایسے لوگ اس بات پر قادر ہوتے ہیں کہ مختلف طبقات کو جوڑ کر ایک ایسا اجتماعی نظام وجود میں لائیں، جس میں تشاور، توافق اور تعاون کا جذبہ پایا جاتا ہو، ایسے لوگ ملک وملت کے لیے انتہائی نفع بخش ہوتے ہیں، وہ بیج کی طرح کھیت میں دفن ہو کر سرسبز وشاداب فصلوں کے لہلہانے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

انفرادی سوچ کو اجتماعی رخ دینے اور مختلف طبقات کو جوڑنے میں بڑی اہم چیز آپس کا مشورہ ہے، یہ مشورہ عمومی ہونا چاہیے اور جن لوگوں کی اس ہدف تک پہونچنے میں ضرورت ہے سب کو جوڑ لینا چاہیے، اس سے ایک دوسرے کا حوصلہ بڑھتا ہے اور کام کو عملی طور پر زمین میں اتارنے میں مدد ملتی ہے، کاموں اور تنظیمی ڈھانچوں کے اعتبار سے کسی کا بڑا چھوٹا ہونا انتظامی ضرورت ہے، لیکن اجتماعی کاموں کو آگے بڑھانے کے لیے ضروری ہے کہ مشوروں میں لوگوں کو شریک کیا جائے، پھر یہ مشورے بند کمروں میں سازشوں کی طرح نہ کیے جائیں، ان میں کُھلا پن لایا جائے، سب کی سنی جائے اور فیصلہ اکثریت پر نہیں قوت دلیل کی بنیاد پر کیا جائے، مشورے کے اس عمل سے مزاجی ہم آہنگی کے ساتھ کام کرنے کے جذبے کو فروغ ملے گا، اسی کو اصطلاح میں توافق کہتے ہیں۔

* نائب ناظم امارت شرعیہ پھلواری شریف

مشورے اور موافقت کے بعد ضروری ہے کہ ایک مہم اور ٹیم کے طور پر کام کو آگے بڑھانے میں لگ جایا جائے، اور مربوط انداز میں کام کیا جائے، کام جس قدر آگے بڑھے اس کی اطلاع بھی ٹیم کے افراد کو رہے، تاکہ کام کے آگے بڑھنے پر حوصلہ افزائی کی جائے اور اگر کہیں کوئی رکاوٹ آ رہی ہے تو اس کو دور کرنے کے لیے سب مل کر کوشش کریں۔

اسلام اجتماعی زندگی کا سب سے بڑا داعی ہے، اس کی عبادتیں اجتماعی زندگی گذارنے کا مظہر اتم ہیں، نماز با جماعت پڑھی جائے، مہینہ بھر کا روزہ ایک ساتھ رکھا جائے، کعبہ، منیٰ، عرفہ، مزدلفہ ہر دن اپنی جگہ پر موجود ہونے کے باوجود حج کے لیے پانچ دن کی تخصیص کا مفہوم بھی یہی ہے کہ اجتماعی طور پر اس عبادت کو انجام دیا جائے۔

اجتماعی زندگی کو برپا کرنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات مبارکہ زندگی کے دوسرے کاموں کی طرح ہمارے لیے نمونۂ عمل ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مومنین کے لیے انتہائی شفیق، رحم دل بلکہ رحمۃ للعالمین بنایا گیا تاکہ لوگ ان کے گرد جمع ہو جائیں، لوگوں کو معاف کرنے اور ان کے لیے مغفرت کی دعا کرنے کی ہدایت دی گئی، مشورہ کرنے پر زور دیا گیا، اور پھر جب فیصلہ ہو جائے تو اسے اللہ پر بھروسہ کر کے کر گزرنے کی بات کہی گئی۔

واقعہ یہی ہے کہ قائدین کا نرم دل ہونا ضروری ہے، اللہ رب العزت نے اپنے محبوب کی یہ صفت خاص بیان کی کہ اللہ رب العزت نے اپنی رحمت سے آپ کو نرم دل بنایا، اگر آپ سخت دل ہوتے تو لوگ آپ کے پاس سے چُھٹ جاتے۔

غلطیاں کام کرنے والے سے ہی ہوتی ہیں، شیخ سعدیؒ نے لکھا ہے کہ ''نہ کردن یک عیب و کردن صد عیب است''، یعنی اگر آپ کام نہیں کرتے تو یہ ایک عیب ہے کہ لوگ آپ کو ناکارہ کہہ کر گذر جائیں گے، لیکن اگر آپ تعمیری کاموں میں لگے ہوئے ہیں تو لوگ دس عیب نکالیں گے، تنقیدیں کریں گے، برا بھلا کہیں گے، ظاہر ہے آپ اور ہم سب انسان ہیں، اس کے اثرات دل و دماغ پر پڑنا فطری ہے، اس سے حوصلے ٹوٹتے ہیں، کام کا جذبہ سرد پڑتا ہے، یہ اثرات دل ودماغ پر کم پڑیں یا نہ پڑیں، اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنے ساتھیوں کو معاف کرنے کا مزاج بنایا جائے، پھر چوں کہ ان کے طرز عمل سے اجتماعی کاموں میں رخنہ پیدا ہو گیا ہے، اس لیے صرف دل سے معاف کرنا کافی نہیں ہے، ان کے لیے مغفرت کی دعا بھی کرنی چاہیے، آپ کے معاف کرنے سے دنیاوی طور پر کام میں خلل نہیں واقع ہوگا اور آپ کی دعاءِ مغفرت اسے آخرت کی باز پرس سے بچانے کا سبب بنے گی۔

معاف کرنے اور مغفرت کی دعا کرنے کے بعد بھی اجتماعی نظام کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ ان کو

مشورے میں شریک کیا جائے، تاکہ وہ یہ نہ محسوس کریں کہ مجھے چھانٹ دیا گیا ہے، چھانٹنے کے عمل سے بھی آدمی ٹوٹ کر انفرادی زندگی کی راہ پر چل پڑتا ہے، جو اجتماعی زندگی کو سبوتاژ کرنے کا عمل ہے۔

اتنے مراحل کے بعد جب مشورہ سے کوئی بات طے ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کر کے کام کا آغاز کر دیا جائے اور اب لیت ولعل کا سہارا نہ لیا جائے، اللہ پر بھروسہ ہمارے کام کی اساس ہے، اخلاص کے ساتھ اس راہ پر آگے بڑھتے رہنا چاہیے۔ بہت سارے لوگ اس کے بعد بھی کوشاں ہوتے ہیں کہ جو دن مقرر کیا گیا ہے اس تک پہونچنے میں رکاوٹیں کھڑی کریں اور ان کا طریقہ کار یہ ہوتا ہے کہ غیر ضروری مشورے دے کر کامیابی کے یقین کو تذبذب میں ڈالنے اور شکوک وشبہات پیدا کرنے میں اپنے تئیں ان کی پوری کوشش یہ ہوتی ہے کہ اپنے مفاد کے لیے اجتماعی منصوبوں کو انفرادیت کی طرف لے جائیں تاکہ ان کی اہمیت برقرار رہے۔ ایسے لوگ اجتماعی زندگی کے تقاضوں کو نہیں سمجھتے، وہ اپنے خول سے باہر نہیں نکل پاتے، بظاہر وہ اجتماعی زندگی سے جُڑے ہوتے ہیں، لیکن وہ اندر ہی اندر اجتماعیت کو فنا کے گھاٹ اتارنے کے لیے کام کرتے ہیں، ایسے لوگوں سے ہمہ وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔

اجتماعی زندگی کی سب سے چھوٹی اکائی خاندان ہوتا ہے اور سب سے زیادہ جھگڑے اجتماعی زندگی کے تقاضوں کی رعایت نہ کرنے کی وجہ سے ہی پیدا ہوتے ہیں، خاندان کا سربراہ اگر ان امور کی رعایت کرے، ہر کام میں گھر کے لوگوں سے مشورہ لینے کے ساتھ ان کی بھول چوک کو نظر انداز کرنے کا مزاج بنالے تو یہ جھگڑے ختم ہو جائیں گے، لیکن وہاں بھی اپنی سرخروئی اور گارجین سے قریب ہونے کی خواہش کی وجہ سے افراد ایک دوسرے سے دور ہوتے چلے جاتے ہیں اور خاندان ٹوٹ کر رہ جاتا ہے، آج خاندانی انتشار اور بکھراؤ کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ وہاں بھی اجتماعی زندگی کے تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھا جا رہا ہے۔

اجتماعی زندگی کو مضبوط، مربوط اور مستحکم کرنے کے لیے انابت الی اللہ بھی انتہائی ضروری ہے، کیوں کہ لوگوں کے قلوب تو اللہ رب العزت کے ہاتھ میں ہیں، سارے کام اسی کی مرضی اور مشیت سے ہوتے ہیں، ہمیں چوں کہ اللہ کی مرضی کا پتہ نہیں اس لیے اسباب کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے، نتیجہ وہی آنا ہے جو مرضی مولیٰ ہے۔

اجتماعی کاموں کو آگے بڑھانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ملکی قوانین کے تقاضوں کو ملحوظ رکھا جائے، اور منصوبہ بندی کرتے وقت مضبوطی سے قوانین کی پاسداری کی جائے، یقینا بہت سارے لوگ قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینے پر یقین رکھتے ہیں اور اس کی وجہ سے ہمیں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہذا ہمارا عمل ملکی قوانین کے دائرے میں ہونا چاہیے، ہمارے بڑوں نے یہی سکھایا ہے اور یہی وقت کا تقاضہ بھی ہے۔

لمحہ فکریہ

حضرت مولانا علی میاںؒ اور فکرِ وطن

مولانا محمد نفیس خاں ندوی*

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم۔ امابعد!

ہمارا ملک ہندوستان قدیم زمانہ سے مختلف قوموں، نسلوں اور تہذیبوں کا گہوارہ رہا ہے، یہاں کے ثقافتی دھاروں میں مشرق کی روایتی انسانیت دوستی اور انسان نوازی کے رجحانات موجِ تہہ نشیں کی طرح متحرک و موجود رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ یہاں کے مذہبی دانشوروں نے ہمیشہ تہذیبی و سماجی اصولوں اور انسانی اقدار کو اپنانے پر زور دیا ہے چنانچہ سنتوں رشیوں، پیروں فقیروں اور مشائخ و صوفیاء کی تعلیمات و طرزِ حیات نے یہاں کی عوامی زندگی کو خاص طور سے متاثر کیا، اور یہاں کے فنونِ لطیفہ، شعر و ادب اور فکر و فلسفہ میں انسانیت نوازی ایک نمایاں رجحان کی طرح جلوہ گر رہی۔

انگریزوں نے اپنے دورِ اقتدار میں یہاں کی امن پسند و انسان دوستی کے ماحول کو نشانہ بنایا اور ''لڑاؤ اور حکومت کرو'' کی پالیسی اختیار کی، درجنوں ہندو مسلم فسادات کروائے جن سے ان کا دورِ اقتدار بڑھتا ہی گیا، آزادیٔ ہند کے بعد فرقہ پرست و سماج دشمن عناصر نے بھی یہی پالیسی اختیار کی، جس کے نتیجہ میں فسادات کا ایک سلسلہ چل پڑا، کبھی ذات و برادری کے نام پر اور کبھی قوم و مذہب کے نام پر انسان انسان کے خون کا پیاسا ہوا، لاکھوں جانیں ہلاک ہوئیں، اور اربوں کھربوں کی جائیدادیں تباہ و برباد! یہ فسادات ہندوستان کی پیشانی پر بدنما داغ و دھبے بن کر ابھرے جن سے ملک کی بنیادیں ہل گئیں، اور ترقی کی راہ پر دوڑنے والا یہ ملک لڑکھڑاتا ہوا اوندھے منھ جا گرا۔

ملک کے نازک و پیچیدہ حالات، شک و شبہ کے ماحول اور نفرت و عداوت کی فضا میں مختلف پارٹیوں کے رہنماؤں کے ساتھ جہاں مولانا حفظ الرحمن اور ڈاکٹر سید محمود جیسے لیڈر ہندو مسلم اتحاد کے لیے سرگرم ہوئے، وہیں مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے اس دیش کی ترقی و بہبود کے لیے نہ صرف راہنما اصول و خطوط فراہم کیے بلکہ ہر نازک و حساس موڑ پر ملک اور حکومت کی رہنمائی کا بے لوث و بے غرض فریضہ بھی انجام دیا

* رفیق دارعرفات، تکیہ کلاں، رائے بریلی

اوراپنی زندگی کے حسین وقیمتی لمحات بھی اس ملک کی ترقی واستحکام کے لیے وقف کردیے، جس کا کھلا ہوا اعتراف حکومت ہند کی جانب سے متعدد بار ''پدم بھوشن ایوارڈ'' کی پیش کش ہے۔

حضرت مولانا اپنے گھر کی طرح اس ملک کے لیے فکر مند رہا کرتے تھے، اوراپنی تحریروں وتقریروں کے ذریعہ لوگوں میں اسی فکرواپنائیت کو پیدا کرنا چاہتے تھے، آپ کہا کرتے تھے:

''ہندستان ہمارا وطن ہے، ہم کو اللہ نے یہاں پیدا کیا، اور ہمارے لیے اس سرزمین کا انتخاب کیا، آدمی کو اپنے گھر سے محبت ہوتی ہے، یہ ہمارا گھر ہے، اس میں ہمیں ایسا طرزعمل اختیار کرنا چاہیے کہ لوگوں کی اصلاح ہو؛ بلکہ زندگی میں انقلاب آئے، بلکہ تمام دنیا میں جو اندھیرا ہورہا ہے اس میں کمی ہو، ظلم بند ہو، خدا کا خوف عام ہو، اورانسانیت کا احترام ہو۔''

(کاروان زندگی/جلد ہفتم صفحہ ۲۶۳)

حضرت مولانا کی نظر میں اس ملک کا وقار وعظمت اورمولانا کی حب الوطنی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ آپ عالمی سطح پر اس ملک کی اخلاقی قیادت کے خواہشمند تھے، چنانچہ ایک اجلاس میں جس کی صدارت بشمبر ناتھ پانڈے کررہے تھے مولانا نے فرمایا:

''اس ملک کو دنیا کی اخلاقی قیادت کرنی چاہیے، دنیا کی بڑی طاقتوں اور بڑے ممالک نے اپنے آپ کو اس قابل نہیں رکھا کہ وہ دنیا کی قیادت کرسکیں، میں آپ سے صاف کہتا ہوں کہ آج دنیا میں وہ تخت خالی ہے جس پر ایک بڑا ملک بیٹھے اور دنیا کو اخلاق، سچی خداترسی اور خدا کی محبت میں بلااختلاف رنگ ونسل، انسانوں کو سینہ سے لگائے اوران سے محبت اوران کی خدمت کرے۔''

(کاروان زندگی/جلد چہارم صفحہ ۱۳۱، ۱۳۲)

حضرت مولانا کی نظر میں یہ ملک ایک حسین گلدستہ کی طرح تھا لیکن افسوس کہ آزادی کے بعد فسادات کی موج صرصر میں یہ حسین گلدستہ جھلس کررہ گیا اور مولانا کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا، بقول مولانا محمد رابع حسنی ندوی مدظلہ:

''مولانا ہندستان کے وقار کو ساری دنیا میں بلند دیکھنا چاہتے تھے لیکن آزادی کے بعد یہاں جس طرح تہذیبی وسیاسی انزال اور زوال ہوا مولانا اس پر رنجیدہ تھے، وہ اس ملک کے عوام کی بے چینی ولاپروائی سے بھی کبیدہ خاطر رہا کرتے تھے،......مولانا ملک کی آزادی کے ساتھ سماجی تبدیلی کے بھی خواہاں تھے، وہ کہتے تھے کہ اگر ملک کے سب لوگ خودغرض ہوجائیں گے تو ملک کیسے چلے گا؟'' (ہفت روزہ نئی دنیا، مفکر اسلام نمبر/۱۵)

باخبر حضرات اس حقیقت سے بے خبر نہیں کہ ہمارے ملک میں مختلف مذاہب اور اقوام وملل سے وابستہ افراد رہتے بستے ہیں، اور ان سب کی رعایت کرتے ہوئے قابل قبول ایک سیکولر اور جمہوری دستور بنایا گیا ہے، لیکن ذاتی مفادات، تنگ نظری اور عصبیت کے شکار لوگ یہاں کے دستور میں تبدیلی لانے کے لیے کوشاں ہیں، حضرت مولانا اس نظریہ کو ملک کے لیے سنگین خطرہ قرار دیتے تھے چنانچہ سابق وزیر اعظم جناب دیوگوڑا کو ایک مکتوب میں متوجہ کرتے ہوئے فرمایا:

''جنگ آزادی کے رہنماؤں اور ہمارے ملک کے بعید النظر اور عمیق النظر قائدین نے اس ملک کے لیے جن تین اصولوں اور شرطوں کی پابندی ضروری قرار دی تھی اور جو اس ملک کی سالمیت، حفاظت اور ترقی کے لیے شرط ہیں یعنی (۱) جمہوریت (Democracy) (۲) نامذہبیت (Secularism) (۳) اور عدم تشدد (Non-Violenc)۔

اس لیے آج بھی اور آئندہ بھی ان تینوں اصولوں پر قائم رہنے اور ان کو قائم رکھنے کی سخت ضرورت ہے، ورنہ کثیر المذاہب، کثیر اور متنوع تہذیبوں، ثقافتوں، اور معاشرتی نظام رکھنے والا ملک ہمیشہ میدان جنگ بنا رہے گا، اور طاقتیں اور قابلیتیں ملک کو ترقی دینے کے بجائے خطروں، خانہ جنگی اور انتشار کو دور کرنے میں صرف ہوں گی۔'' (کاروان زندگی/جلد ششم صفحہ ۲۵۶-۲۵۷)

وطن عزیز کے تئیں حضرت مولانا کی خدمات کا کینوس خاصا وسیع اور اہم ہے، آپ کی متحرک وفعال شخصیت خود ایک تحریک تھی، نیز آپ کی تصنیفات اور سربراہان کو خطوط وہدایات کے علاوہ تحریک پیام انسانیت، مسلم مجلس مشاورت، دینی تعلیمی کونسل اور مسلم پرسنل لا بورڈ خاص طور پر وہ نمایاں میدان ہیں جو آپ کی عظمت کا نشان اور منارۂ امتیاز ہیں۔

پیام انسانیت

ہندستان نے آزادی کے بعد سے ہی لاقانونیت، تعصب وتنگ نظری اور خانہ جنگی کی طرف قدم بڑھانا شروع کردیا تھا، سیاسی پارٹیوں کا مقصد' حصولِ اقتدار اور پھر اس اقتدار کی بقاوسلامتی کے سوا کچھ نہ تھا، ملک کی تعمیر وترقی اور اتحاد ویکجہتی سے صرف اس حد تک دلچسپی تھی کہ ان کے اقتدار پر ضرب نہ لگے، اس ذہنیت کا اثر ہندستان کی عمومی فضا میں محسوس ہونے لگا تھا، حضرت مولانا کا مزاج گرچہ تصنیف وتالیف کا تھا لیکن ملک کے بدلتے حالات نے آپ کو فکر مند کردیا اور صاف محسوس کیا کہ اگر اس ذہنیت کو فروغ حاصل ہوا تو یہ ملک خانہ جنگی کی نذر ہوجائے گا، اور آزدی کے لیے دی گئی ساری قربانیاں ضائع ہوجائیں گی، چنانچہ 1951 سے 1956ء

کے دوران آپ نے غیر مسلم اکثریت برادران وطن کو متوجہ کرنے اور ان کے ذہن وضمیر تک پہنچنے کی کوشش کی، ملک کے چیدہ ومنتخب اور باشعور ودانشور طبقوں کی معیت میں ''مخلوط جلسوں'' کا سلسلہ شروع کیا، ان جلسوں کا محور زندگی کے مشترک مسائل، اخلاق وانسانیت اور ملک کے مفاد واہل وطن کی ذمہ داریاں تھا۔

حضرت مولانا ؒ ان جلسوں کی کامیابی اور ان کے دوررس اثرات کو بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''تجربے سے معلوم ہوا کہ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت تھی، یہ جلسے ہم سب کی توقع اور اندازہ سے بہت بڑھ کر کامیاب ہوئے، ان میں ہزاروں مہذب اور تعلیم یافتہ شہریوں کا مجمع ہوا، جس نے اتنے سکون واطمینان اور رغبت اور دلچسپی سے تقریریں سنیں جس پر سیاسی کارکنوں کو بھی حیرت ہوئی۔ پھر معزز سامعین نے اپنے تاثرات کا اظہار اس انداز میں کیا جس سے عمل اور دعوت کا ایک نیا میدان سامنے آگیا اور معلوم ہوا کہ ہمارے ملک میں صداقتوں اور حقیقتوں کے سمجھنے کی کتنی استعداد اور صلاحیت موجود ہے، اور خودغرض قومی وسیاسی تحریکوں نے عام آدمیوں کو کتنا مایوس کر دیا ہے، نیز یہ کہ اندھی اور بے ضمیر مادیت کے خلاف کتنا جذبہ اور کیسا اضطراب پایا جاتا ہے، یہ اس ملک اور اس دور کے لیے ایک فال نیک ہے اور امید کی ایک بہت بڑی شعاع۔''

(مقام انسانیت صفحہ:۷)

مخلوط اجتماعات کا سلسلہ اگرچہ جاری نہ رہ سکا تھا لیکن حضرت مولانا کو اس کی افادیت وضرورت کا بڑا احساس تھا، مولانا کے خیال میں جو بڑی دوراندیشی اور حکمت وبصیرت پر مبنی تھا، اتنے طویل وعریض ملک میں جس میں اکثریت غیروں کی ہو، ان کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا تھا، اور خاص طور پر ایسے ماحول میں جہاں بدگمانیاں بڑھ رہی ہوں، سیاسی صف بندیاں ہورہی ہوں اور اکثریت کے طبقہ میں اقلیت کے بارے میں توحش وتنفر پیدا کیا جارہا ہو، خاموش تماشائی بن کر رہنا بڑے خطرہ کا پیش خیمہ بن سکتا تھا، چنانچہ ۲۸، ۲۹، ۳۰/دسمبر ۱۹۷۴ء کو الہ آباد میں اس موضوع پر ایک بڑی کانفرنس بلائی گئی اور ان الفاظ کے ساتھ ہمہ گیر مہم کا آغاز کر دیا گیا

''افسوس ہے کہ اس لمبے چوڑے ملک میں اخلاقی کمزوریوں کو دور کرنے اور روحانی اور انسانی زندگی کو رواج دینے کے لیے کوئی تحریک اور کوئی جماعت نظر نہیں آتی، ہم نے بہت انتظار کیا اور آخر یہ فیصلہ کیا کہ جو کچھ بن پڑے اس کو شروع کر دیں۔''

(تحریک پیام انسانیت کے بارے میں ایک اہم انٹرویو، صفحہ:۲۰)

یہ پیام انسانیت کی تحریک تھی جو اس اعتبار سے بھی ممتاز اور منفرد تھی کہ یہ عام تحریکوں اور نظریوں کی طرح

نہ کوئی سیاسی تحریک تھی اور نہ اس میں ذاتی مفاد و منفعت کے حصول کا جذبہ تھا، بلکہ ملک وملت کے تئیں اخلاقی وسماجی ذمہ داری کا نصب العین تھا، اور مولانا کی تقریریں حب الوطنی، انسانی ہمدردی اور باہمی اخوت ویکجہتی کی اعلیٰ ترجمان تھیں۔

ہندوستان کے فرقہ وارانہ فسادات کے پس منظر میں پیام انسانیت کی معنویت دوچند ہوجاتی ہے، ہندوستان کے مخصوص حالات اور وقت کی انتہائی ناگزیر ضرورت پر مولانا نے لبیک کہا اور بلاتفریق مذہب وملت اس کے تمام باشندوں کے دلوں پر دستک دینے کا عزم مصمم کیا، اس لحاظ سے مولانا کا یہ مستحسن اقدام داعی حق کے علاوہ ایک سچے اور مخلص وطن دوست ہونے پر بین شہادت ہے، کاروان زندگی کی عبارتیں مولانا کے اضطراب وبے چینی اور تحریک پیام انسانیت کی اہمیت پر شاہد وناطق ہیں، ملاحظہ ہو:

"کسی ملک اور کسی بھی دور میں تعمیری وتعلیمی کاموں کے لیے خواہ وہ کتنے مقدس ضروری اور مفید ہوں شرط یہ ہے کہ اس ملک میں معتدل حالات ہوں، جہاں کوہ آتش فشاں بار بار پھٹتا ہو، سائیکلون جلد از جلد آتے ہوں، سیلاب اپنی قہر سامانیوں کے ساتھ پورے پورے شہر اور صوبوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہو وہاں تعلیمی اور تعمیری کام کے لیے دماغی سکون اور ولولۂ عمل کہاں سے پیدا ہوسکتا ہے؟ یہ تو غیر اختیاری امور ہیں اور ان پر کسی کا کوئی قابو نہیں، لیکن جہاں فرقہ وارانہ فسادات، انسان کشی اور انسانیت سوزی کے جنون کی لہریں اٹھتی ہوں، جہاں دولت وقوت کے سوا کوئی اور حقیقت زندہ اور مسلم نہ مانی جاتی ہو، وہاں کسی تعلیمی یا تعمیری کام یا کسی ادارہ کی بقا کی ضمانت کب تک دی جاسکتی ہے اور اس غیر یقینی اور ہیجانی فضا میں کوئی تصنیفی یا فکری کام کیسے ہوسکتا ہے؟!" (کاروان زندگی/جلد دوم صفحہ ۲۳۰)

مسلم مجلس مشاورت

تقسیم ہند کے بعد اس ملک میں جو صبر آزما اور دشوار گذار حالات پیش آئے ان میں سب سے زیادہ تشویش ناک فسادات کا غیر منقطع سلسلہ تھا، جہاں ہر فساد اپنی جداگانہ نوعیت کے ساتھ ایک سوالیہ نشان تھا، ۱۹۶۳ء کے اواخر اور ۱۹۶۴ء کے اوائل میں فسادات کا یہ سلسلہ شروع ہوا کہ جس نے پورے ملک کو ہلا کر رکھ دیا۔ کلکتہ، جمشید پور، رانچی، راوڑکیلا اس کی زد میں آئے، یہ بڑے بڑے صنعتی شہر تھے جہاں مسلمانوں کو بے دریغ قتل کیا گیا، عصمتیں پامال کی گئیں، اور ہر طرح کی نفرت انگیز وشرم ناک حرکت روا رکھی گئی، فسادات تو ان خاص شہروں میں ہوئے لیکن یہ پورے ملک کے لیے خطرہ کا سائرن تھا، ہر صاحب ضمیر ہندوستانی اور محب

وطن کے لیے بہت ہی فکر اور تشویش کی بات تھی۔ چنانچہ حضرت مولانا نے خود فساد کی ان جگہوں کا دورہ کیا، حالات کی سنگینی کو محسوس کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ اب بھی ملک کے اکثریتی فرقہ میں ایک بڑا طبقہ ایسا موجود ہے جس کا ذہن میلا نہیں ہوا اور جو ملک کی بقاء اور اس کی سالمیت کے لیے فکر مند ہے، مولانا نے کوشش کی کہ حالات کے سدھار اور فسادات کے سد باب کے لیے اکثریتی فرقہ کے ہی کچھ سرفروش وجانباز قائدین کو سامنے لایا جائے، اور اس کارِ خیر کے لیے مولانا نے دو اہم شخصیات: جے پرکاش نارائن اور ونوبھا بھاوے کا انتخاب کیا، ان سے ملاقاتیں کیں، افہام وتفہیم کی کوششیں کیں، فسادات کی سنگینی، ملک کی عمومی تباہی اور پیچیدہ وفیصلہ کن صورت حال کی طرف متوجہ بھی کیا، لیکن افسوس کہ حالات کے تقاضوں کو وہ سمجھ نہ سکے اور دو قدم بھی مولانا کے ساتھ چلنے کو تیار نہ ہوئے، ان کی سرد مہری سے یقینا حضرت مولانا رنجور وکبیدہ خاطر ہوئے ہوں گے لیکن ملک وقوم کی محبت وتڑپ نے آپ کو ٹوٹنے نہ دیا، اور حالات کے سامنے سپر ڈالنے کے بجائے آپ نے خود مسلمانوں کو یہ اخلاقی خلا پر کرنے اور قیادت کی ذمہ داری قبول کرنے کی دعوت دی۔ اور پھر مفتی عتیق الرحمن عثمانی، مولانا محمد مسلم (مدیر دعوت)، ڈاکٹر عبدالجلیل فریدی اور ڈاکٹر سید محمود کے تعاون سے ایک مشاورتی اجتماع منعقد ہوا جس میں ''مسلم مجلس مشاورت'' کا قیام عمل میں آیا۔

مسلم مجلس مشاورت کے محرکات، اور اس کے مقاصد وقیام کا تذکرہ خود حضرت مولانا ؒ نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> **''ملک میں ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے جس سے یہ اعصابی تناؤ کم ہو، ملک کے شہری' انسانوں اور ہم وطنوں کی طرح ایک دوسرے کے ساتھ زندگی گذارنے پر آمادہ ہوں، اور انسانیت کا احترام پیدا ہو، اور دلوں سے منافرت کا وہ زہر امکانی حد تک دور ہو جو فرقہ وارانہ سیاست، اشتعال انگیز تقریروں اور غیر ذمہ دار پریس نے پیدا کر دیا ہے۔''**

(کاروان زندگی/جلد اول، صفحہ ۵۰۴)

حضرت مولاناؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہماری قسمت اس ملک سے اور اس ملک کی قسمت ہم سے وابستہ ہے، یہی وجہ ہے کہ آزادی کے بعد سے ملک کو درپیش مسائل، فیصلہ کن حالات، نازک ترین صورتحال، روز افزوں نت نئے مسائل کے مولانا محض تماشائی نہ تھے، آپ کا دل' دردمند اور روح' بے چین تھی، آپ عملی سیاست کے آدمی نہیں تھے لیکن جب ملک کے حالات خراب ہوئے، اور فرقہ وارانہ فسادات نے ملک کی سالمیت کو خطرہ میں ڈال دیا تو آپ پوری قوت اور تندہی کے ساتھ سرگرم ہوئے، اور فسادات کی روک تھام اور مظلوموں کے

تحفظ کے لیے سرگرم ہو گئے، چنانچہ ۱۹۸۹ء میں ملک عزیز کو فرقہ واریت اور تشدد کی آگ میں جھلستے دیکھا تو بڑی جرأت و بیباکی کے ساتھ انتظامیہ اور اساطین حکومت کو نا مساعد حالات کا ذمہ دار ٹھراتے ہوئے خبردار کیا:

”ملک میں اس وقت فرقہ پرستی اور تشدد کی جو لہر آئی ہے وہ بے حد تشویشناک ہے، مجھے افسوس ہے کہ انتظامیہ کی تساہلی اور ضرورت سے زیادہ مصلحت اندیشی نے بابری مسجد، رام جنم بھومی کے مسئلہ کو حل کرنے میں نہ صرف تاخیر کی بلکہ احیاء پرست تنظیموں کو من مانے ڈھنگ سے اپنے پروگرام پر عمل کرنے کا موقع دے کر ملک کی یکجہتی اور ہم آہنگی کو سخت صدمہ پہنچانے کا موقع فراہم کر دیا، اس سلسلہ میں بھاگلپور، بدایوں، بنارس، اور اندور وغیرہ میں جو کچھ پیش آیا وہ سخت تکلیف دہ اور نا قابل شکایت ہے، لوگوں کی جان و مال کی حفاظت اور امن قائم رکھنا حکومت کا اولین فریضہ ہے۔“ (کاروان زندگی/جلد چہارم صفحہ ۱۳۹)

دینی تعلیمی کونسل

آزاد ہندستان کے دستور میں شامل تھا کہ یہ ایک سیکولر ملک ہوگا، اور یہاں کا نصاب تعلیم بھی سیکولر ہی ہوگا، لیکن جس طرح حکومت کے مختلف شعبوں میں مذہبی منافرت کو فروغ دیا جا رہا تھا اس سے یہاں کا تعلیمی نظام بھی محفوظ نہ تھا، اور ایک ایسے ملک میں جس نے ترقی کی راہ پر چلنا ابھی شروع ہی کیا ہو وہاں بچوں کے ذہنوں میں مذہبی منافرت کا زہر گھولنا یقینا تباہی کا باعث ہے، چنانچہ درسی کتابوں میں مشرکانہ افکار و عقائد اور تہذیب و ثقافت کے امکانی خطرات کے پیش نظر ایک طرف آپ نے ذمہ داران حکومت کو اس کی طرف متوجہ کیا اور دوسری طرف مسلمانوں کو اپنا تعلیمی نظام مرتب و منظم کرنے کی عملی دعوت بھی دی۔

8/فروری 1993ء کو حضرت مولانا نے ”ملک کی آزادی کا صحیح مطلب اور فائدہ“ کے عنوان سے رائے بریلی میں ایک عظیم الشان اجلاس میں انگریزی دور حکومت اور آزاد ہند کے دور حکومت کے بنیادی فرق کو واضح کرتے ہوئے امن و امان کی بگڑی ہوئی صورتحال کا تذکرہ کیا، سیاسی تنگ نظری و غلط کاری کے سبب اقلیتوں کے اپنے عقیدہ و مذہب اور تہذیب و ثقافت کے مطابق زیست کرنے میں دشواریوں اور ان کے تعلیمی اداروں کی آزادی سے متعلق اپنی تشویش کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا:

”کسی آزاد ملک میں جس نے ملک کی آبادی کے تمام عناصر اور قوموں اور فرقوں کے تعاون، جد وجہد اور قربانیوں کے ذریعہ آزادی حاصل کی ہو، اس کی قیادت اور رہنمائی میں ملک آزاد ہوا ہو، اِس کا کوئی جواز نہیں کہ کوئی ایک فرقہ یا قوم (Community) نہ صرف اپنی تہذیب

وثقافت، اپنے عقائد اور دیومالائی تعلیم وتبلیغ اور اس کو اپنی نسل کی طرف منتقل کرنے اور اپنی زبان اور رسم الخط کے نہ صرف رواج دینے اور قائم رکھنے میں بلکہ پورے ملک پر اور نئی نسل پر اس کو جاری اور رائج کرنے میں آزاد ہو اور دوسرا فرقہ (Community) اپنے دین مذہب کے مطابق تعلیم دینے، اپنی زبان ورسم الخط کی ترویج وبقا، اپنی تہذیب وثقافت کے تسلسل کی کوشش میں آزاد نہ ہو، روز بروز اس پر نئی نئی پابندیاں عائد کی جائیں۔"

ملک کی یہ صورتحال اس بات کی غماز تھی کہ اگر حالات سے چشم پوشی کی گئی اور مذہبی منافرت کے بیج کو برگ وبار لانے کا موقع دیا گیا تو اس ملک کو خانہ جنگی وعمومی تباہی سے کوئی طاقت نہیں روک سکے گی، چنانچہ مدارس ومکاتب کو فروغ دینے کا عملی منصوبہ بنایا گیا، اور 1959ء میں حضرت مولانا کی سرپرستی اور قاضی عدیل عباسیؒ کی کوششوں سے "دینی تعلیمی کونسل" کی شروعات کی گئی۔

حضرت مولانا نے کونسل کے پہلے صدارتی خطاب میں حکومت کی عدم توجہی، دستور ہند اور سیکولرازم کے برعکس شعبۂ تعلیم میں حکومت کے غیر جمہوری اقدام پر بے لاگ تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"47ء کے بعد اس ملک کے مسلمانوں کو ایک ایسی صورتحال سے سابقہ پڑا جس کی قطعاً توقع نہیں تھی اور جو اس ملک کے حالات اور دستور سے ذرا بھی مطابقت نہیں رکھتی، یہاں ایک ایسا نظام تعلیم جاری کیا گیا جس میں کھلے طریقے پر ایسے مذہبی تصورات اور روایات کی نمائندگی ہے جس سے نہ صرف یہ کہ مسلمانوں کی مذہبی حس مجروح ہوتی ہے بلکہ وہ ان کے اعتقادات ومسلمات سے متصادم ہے، اس فلسفہ اور مذہبی تصورات وروایات کو ہم ہندو علم الاصنام یا ہندو میتھالوجی کے علاوہ کسی لفظ سے صحیح طور پر تعبیر نہیں کرسکتے۔"

حضرت مولاناؒ کی یہ جرأت وبے باکی ایک مؤمن صادق کی صدائے حق اور ایک انصاف پسند مؤرخ کی نگاہ دوررس کے ساتھ ایک محب وطن کی لازوال حب الوطنی اور ایک معمار قوم ونسل کی دردمندی وفکرمندی کی آئینہ دار تھی، چنانچہ بغیر کسی جھول وجھجک کے آپ نے کھلے لفظوں میں کہا:

"ہم اپنا جمہوری، مذہبی، اخلاقی اور شہری حق سمجھتے ہیں کہ اس کے خلاف آواز بلند کریں کہ ملک کے دستور نے ہر اقلیت اور ہر اکائی کو اس کی اجازت دی ہے کہ وہ اپنی پسند کے مدارس قائم کرے، اور اپنی پسند اور صوابدید کے مطابق ان کو چلائے، ہم خالص حب الوطنی اور ہندوستان کے لیے اس کو باعث فخر سمجھنے کی بنا پر یہ کہتے ہیں کہ تعلیم وتربیت اور ثقافت وتہذیب کو پھیلانے

میں ایثار وقربانی کی اس روایت کو جو ہندستان کی قدیم تاریخ کا بھی طرۂ امتیاز ہے، باقی رہنا چاہیے۔"

حضرت مولانا علیہ الرحمہ تقریباً چالیس سال تک کونسل کے صدر رہے، اس پوری مدت میں انتہائی نازک اور تشویش ناک دور وہ تھا جب حکومتِ اتر پردیش نے پرعزم و پرحوصلہ ہوکر اسکولوں میں وندے ماترم کو نافذ کیا اور بھارت کی تصویر پر پھول چڑھانا لازم قرار دیا، کلپ یوجنا کے نام سے ایک پوری تعلیمی اسکیم کا خاکہ تیار ہوا، سخت تیور کے ساتھ اس کے نفاذ کا حکم نامہ بھی جاری ہوا، کونسل نے اس فیصلہ پر فوراً نوٹس لیا اور دستور ہند کی روشنی میں اس کی زبردست مخالفت کی گئی، علی گڑھ کے کنیڈی ہال میں ایک کنونشن منعقد ہوا جس میں حضرت مولاناؒ نے جذبۂ ایمانی وجذبۂ حب الوطنی کے جوش کے ساتھ کہا:

"یہ ملک کو ایسی خطرناک منزل کی طرف لے جانے کا اقدام ہے جس کے تصور سے ایک محب وطن کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، اور اس کی راتوں کی نیند حرام ہوجاتی ہے۔"

ایک موقع پر صحافیوں کی ایک بڑی تعداد کے سامنے اپنی غیرت ایمانی وغیرت وطنی کو پوری قوت کے ساتھ اس طرح ظاہر کیا:

"اگر یہ صورت حال باقی رہتی ہے اور حکومت نے وندے ماترم اور پھول چڑھانے کا غیر اسلامی فیصلہ تبدیل نہیں کیا تو ایسے تمام اسکولوں سے مسلمان اپنے بچوں کو نکال لیں گے، ہمارے لیے تعلیم سے زیادہ عقیدہ اور دین کی حفاظت کا مسئلہ اہم ہے۔"

حضرت مولاناؒ کے اس بیان سے پورا ملک چونک گیا، حکومت متوجہ ہوئی، اس کے رویہ میں تبدیلی آئی، اور فضا کا رنگ ورخ یکسر بدل گیا۔

مسلم پرسنل لا بورڈ

ہمارے اس ملک کی بنیاد ہی جمہوریت اور سیکولرزم پر ہے، آزادی کے رہنماؤں نے بار بار اس کا اعلان کیا تھا اور اطمینان بھی دلایا تھا، نیز آزاد ہندوستان نے اپنے لیے غیر دینی طرز حکومت کا انتخاب کرکے اس فیصلہ پر مہر بھی لگادی تھی لیکن آزادی کے بعد مسلمانوں کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا جن کی ملک کے دستور وآئین سے کوئی مطابقت نہ تھی، فرقہ پرست طاقتوں نے ملک کی سیکولر ساکھ کمزور کرنے اور جمہوری اقدار کو پامال کرنے کی سازش رچی اور ملک کے مذہبی امتیازات کو ختم کرکے مشترکہ عائلی قانون (Uniform Civil Code) کو نافذ کرنے کی کوششیں کیں۔

حکومت کا یہ رویہ نہ صرف مسلمانوں کی مذہبی آزادی کے خلاف تھا بلکہ ہندوستان کی گنگا جمنی تہذیب اور سیکولر وجمہوری نظام کے مخالف بھی تھا، چنانچہ غیور ومحب وطن علماء وقائدین نے سنجیدگی سے اس کا نوٹس لیا اور 1972ء کو ایک کنونشن کا انعقاد ہوا اور ''آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ'' کا قیام عمل میں آیا، حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب نوراللہ مرقدہ اس کے صدر منتخب ہوئے، 1983ء میں قاری صاحب کے انتقال کے بعد حضرت مولاناؒ کو متفقہ طور پر بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا۔

1986ء میں سپریم کورٹ نے مطلقہ خاتون کو تاحینِ حیات اس کے شوہر سے نان نفقہ دلانے کا فیصلہ صادر کیا، یہ فیصلہ مسلمانوں کے ان عائلی مسائل میں براہ راست مداخلت تھی جن کا اختیار ہندوستان کے جمہوری نظام میں ان کو حاصل ہے، فیصلہ کا اثر ظاہر ہوا اور پورے ملک میں تناؤ پھیلنے لگا، اس صورتحال پر حضرت مولانا بے چین ہو اٹھے اور بہ حیثیت صدر بورڈ کے اس سے نمٹنے اور آئینی حدود میں اس کا حل نکالنے میں مشغول ہو گئے، جلسے جلوس ہوئے، دورے ہوئے اور اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر راجیو گاندھی سے خصوصی ملاقاتیں ہوئیں، راجیو گاندھی اس سلسلہ میں دیگر اسلامی ممالک سے بھی رابطہ میں تھے، حضرت مولانا نے انھیں یہ احساس دلایا کہ اپنے دامن میں وقیع قیادت کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے اسلامی ملک سے رائے طلب کرنا ہمارے ملکی وقار کے خلاف ہے، یہ ہمارا اندرونی معاملہ ہے جسے ہم لوگ خود ہی حل کریں گے، مولانا کے یہ الفاظ خاص طور پر راجیو گاندھی کی تسکین وتشفی اور اطمینان کا موجب ہوئے، مولانا نے فرمایا:

''ہندوستان علمی ومذہبی حیثیت سے (جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے) کسی مسلم یا عرب ملک سے کم نہیں ہے، وہ خود اپنا مقام رکھتا ہے، مجھے کہنا نہیں چاہیے لیکن کہتا ہوں کہ عالم اسلام کی سب سے بڑی ماہرین قانون شریعت کی اسلام مجلس، رابطہ عالم اسلامی مکہ مکرمہ کی المجمع الفقہی ہے جس کا ہندوستان میں میں تنہا ممبر ہوں، بعض مرتبہ ایسا ہوا کہ سارے ممبر ایک طرف تھے اور میں ایک طرف تھا اور فیصلہ میری رائے پر ہوا۔'' (کاروان زندگی/جلد سوم صفحہ ۱۳۴)

بالآخر سال بھر کی پیہم کوششوں، ملک گیر تحریک، سیاسی رہنماؤں اور حکومت کے بہی خواہوں اور وزیر اعظم سے گفت وشنید اور افہام وتفہیم کے بعد 5,6 مئی 1986 کو اس جدوجہد میں کامیابی حاصل ہوئی، اور ملک کا ماحول آپسی تناؤ، انتشار اور ذہنی کشاکش کے بعد پھر معمول پر آ گیا۔

ہندستان کی تاریخ میں بابری مسجد کا قضیہ ایک بدنما داغ ہے، اور اس حقیقت سے شاید ہی کسی کو انکار ہو کہ یہ قضیہ ہماری کوتاہیں، مفاد پرست اور غیر مخلصانہ سیاست کا پیدا کردہ بھی ہے، بابری مسجد کی شہادت کے بعد

پے در پے فسادات، سنگین واقعات اور دھماکوں کے سلسلے سے نہ صرف ملک کا وقار مجروح ہوا بلکہ ہر سچے محب قوم و وطن کا سر شرم سے جھک گیا، اس شرم ساری اور رسوائی و تباہی کو حضرت مولانا نے بہت پہلے ہی محسوس کر لیا تھا، چنانچہ 4 /نومبر 1989ء کو آپ نے ذہنی کرب، قلبی گداز اور فکر و اضطراب کے ساتھ یہ بیان دیا:

''اس وقت ملک کی فضا بجھی ہوئی گرم بارود کی طرح ایسی دھماکہ خیز ہو رہی ہے کہ کسی وقت بھی اور کسی جگہ بھی وہ فرقہ وارانہ فساد، تصادم اور قتل و خوں ریزی کی شکل اختیار کر سکتی ہے، اس صورتحال کے پیدا کرنے میں رام جنم بھومی اور بابری مسجد کے قضیہ کو بڑا دخل ہے جس کو فریقین کے اکثر لیڈروں نے عوامی جذبات کو مشتعل کر کے اور مظاہروں، جلوسوں اور نعرہ بازی کے ذریعہ حل کرنے کوشش کی اور اس کو آئین و انتظامیہ کے دائرہ میں محدود رکھنے کے بجائے سڑک اور پبلک میں لے آئے اور اس کو مذہبی وقار کا مسئلہ بنا دیا، انتظامیہ کی تساہلی یا مصلحت بینی کو بھی اس میں دخل ہے۔'' (کاروان زندگی/جلد سوم، صفحہ ۱۵۷، ۱۵۸)

قضیہ بابری مسجد کے حل کے لیے حضرت مولانا نے اپنی شخصیت کا پورا زور لگا دیا، اور اس سلسلہ میں ہر اثر انداز شخص سے ملاقاتیں بھی کیں، سیاسی و مذہبی رہنماؤں کو ذاتی ملاقاتوں اور خطوط کے ذریعہ متوجہ بھی کیا لیکن فضا اتنی گرم کی جا چکی تھی اور مسئلہ کو اس طرح سڑکوں پر اچھالا جا چکا تھا کہ سنبھالنا مشکل تھا، نتیجہ وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، 6 / دسمبر 1992ء کو کارسیوکوں کے ہاتھوں مسجد مسمار کر دی گئی اور حکومتیں خاموش تماشائی بنی رہیں۔

قضیہ بابری مسجد میں حضرت مولانا کی فکر مندی و دلسوزی اور آپ کی تڑپ و بے چینی اسلامی نقطۂ نظر کے ساتھ ساتھ انسانی بنیادوں پر بھی تھی، ملک عزیز سے آپ کی محبت کی یہ ایک واضح دلیل ہے کہ اس عظیم سانحہ کو آپ نے ایک ہندوستانی کی نظر سے دیکھا اور ایک سچے محب وطن کی حیثیت سے حل کرنے کی کوشش بھی کی، اسی لیے آپ نے بابری مسجد کی شہادت کو مسلمانوں کا نہیں بلکہ پورے ملک کا عظیم سانحہ قرار دیا اور اپنے بیان میں کہا:

''۶ دسمبر کو اجودھیا میں قدیم تاریخی بابری مسجد کا انہدام اور باوجود اس کی حفاظت کے وعدوں کے اس کو صاف کر دینے کا جو واقعہ پیش آیا اس نے پورے ہندوستان کو ایک کلنک کا ٹیکا لگا دیا اور اس کی سیکڑوں برس کی رواداری، مذہبی آزادی اور صلح پسندی کی روایت کو خاک میں ملا دیا۔ ملک کی آزادی کے لیے جدوجہد کرنے والوں اور قربانی دینے والوں کی محنتوں پر پانی پھیر دیا اور عالمی اور بین الاقوامی سطح پر ہندوستان کو ذلیل کیا۔'' (کاروان زندگی/جلد پنجم، صفحہ نمبر ۱۱۰)

(بقیہ صفحہ:۱۶ پر)

اسلامی آداب واحکام

صدقۃ الفطر؛ فضائل ومسائل

از: مولانا مفتی محمد ندیم الدین قاسمی*

اسلام کا یہ امتیازی وصف ہے کہ اس نے اپنے متبعین کو مواسات ومواخات کا بہترین درس دیا؛ عید ہو یا خوشی کا کوئی اور موقع، اس نے صرف امیروں کے دولت کدہ ہی میں خوشی کے چراغ جلنے نہیں دیئے؛ بلکہ اس موقع پر امیروں کو سماج کے غریب ونادار افراد کے درد وکسک، دکھ وغم کو بانٹنے اور خوشی میں شریک کرنے کی تلقین بھی کی؛ چنانچہ بقرعید کے موقعہ پر قربانی میں ایک تہائی غریبوں کا حق قرار دیا گیا، ولیمہ کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ بدترین ولیمہ وہ ہے، جس میں سماج کے امیر لوگوں کو بلایا جائے اور غریبوں کو نظر انداز کردیا جائے، اسی طرح عید الفطر کی خوشی میں بھی غرباء کو شریک کرنے کے لئے" صدقۃ الفطر" کا ایک بہترین نظام مقرر کیا گیا۔

صدقۃ الفطر کی اہمیت وفضیلت

حضرت جریرؓ سے روایت ہے کہ اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:"صومُ شهرِ رمضانَ معلَّقٌ بين السّماءِ والأرضِ ولا يُرفعُ إلّا بزكاةِ الفطرِ "یعنی رمضان کے روزے آسمان اور زمین کے درمیان معلق (لٹکے) رہتے ہیں، جنہیں (اللہ کی طرف) صدقۃ الفطر کے بغیر نہیں اٹھایا جاتا۔(الترغیب والترہیب:2/157)

صدقۃ فطر کی شرعی حیثیت

مالکیہ کے یہاں صدقۃ الفطر سنت ہے، ان کے علاوہ باقی ائمۂ کرام کے یہاں صدقۃ الفطر واجب ہے، مسلم شریف کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ہر آزاد، غلام، مسلمان مرد وعورت پر صدقۃ الفطر واجب ہے۔(صحیح مسلم، عن عبداللہ بن عمر:984)

حکمت

صدقۃ الفطر کی ادائیگی صرف حکمِ شرع ہی نہیں؛ بلکہ اس کے جلو میں بے شمار دنیوی واخروی فوائد مضمر ہیں؛ چنانچہ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں: فَرَضَ رَسُولُ اللهِ ﷺ زَكَاةَ الْفِطْرِ طُهْرًا لِلصَّيَامِ مِنَ اللَّغْوِ

---

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا

وَالرَّفَثِ، وَطُعْمَةً لِلْمَسَاكِينِ ".(رواہ ابوداؤد)

اس حدیث میں صدقۃ الفطر کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں:

۱۔ مسلمانوں کے جشن و مسرت کے اس موقعہ پر صدقۃ الفطر کے ذریعہ محتاجوں اور مسکینوں کی بھی شکم سیری اور آسودگی کا انتظام ہوجائے۔

۲۔ زبان کی بے احتیاطیوں اور بے باکیوں سے روزے پر جو برے اثرات مرتب ہوں گے، یہ صدقۃ الفطر ان کا بھی کفارہ اور فدیہ ہوجائے گا۔

نیز علماء کرام فرماتے ہیں: وفی إخراجھا قبول الصوم، والنجاح، والفلاح، والنجاۃ من سکرات الموت، وعذاب القبر" (طحطاوی علی مراقی الفلاح)

ترجمہ: صدقۃ الفطر کی ادائیگی سے روزے قبول ہوتے ہیں اور مشکلیں آسان ہوتی ہیں اور کامیابی ملتی ہے اور موت کی سختی اور قبر کے عذاب سے نجات حاصل ہوتی ہے۔

صدقۃ الفطر کس پر واجب ہے؟

جس پر زکوۃ واجب ہے اس پر صدقۃ الفطر بھی واجب ہے،(جس کے پاس ساڑھے سات تولے سونا (87.5 گرام) یا ساڑھے 52 تولے چاندی (612 گرام) یا اس کی موجودہ قیمت کے برابر رقم موجود ہو) البتہ دو معمولی فرق ہیں، زکاۃ کے نصاب میں مال نامی اور سال گزرنا ضروری ہے؛ جب کہ صدقۃ الفطر میں مال نامی اور سال گزرنا ضروری نہیں، عید کی صبح تک اتنی مالیت کا مالک ہوگیا تو صدقۃ الفطر ادا کرنا واجب ہے۔

(فتاویٰ دارالعلوم: ۶/ ۲۰۴)

ادائیگی کا وقت

بہتر یہ ہے عید الفطر کے دن نمازِ عید کے لئے جانے سے پہلے پہلے صدقۃ الفطر ادا کر دیا جائے، یہ افضل وقت ہے، حدیث میں ہے: أنَّ رسولَ اللّٰہِ ﷺ کانَ یأمرُ بإخراجِ الزَّکاۃِ قبلَ الغدوِ للصَّلاۃِ یومَ الفطرِ۔(عن عبداللہ عمر، صحیح الترمذی: 677)

اگر کوئی ادا نہ کر سکے تو بعد میں ادا کرے؛ لیکن اس وقت اتنا ثواب نہیں ملے گا۔

صدقۃ الفطر کا مصرف

جن لوگوں کو زکات دینا جائز ہے ان کو صدقۃ الفطر بھی دینا جائز ہے۔(الفتاوی الہندیۃ 5/181)

صدقۃ الفطر کی مقدار

فقہاء حنفیہ کے نزدیک گیہوں یا اس کے آٹا سے نکالنا ہو تو نصف صاع اور کھجور، کشمش اور جو سے نکالنا ہو تو ایک صاع دینا چاہیے. واضح رہے کہ گندم کے اعتبار سے صدقۃ الفطر کی مقدار پونے دو کلو گیہوں ہے، جب کہ کھجور، جو اور کشمش کے اعتبار سے ان اشیاء کی مقدار ساڑھے تین کلو مقدار ہے۔(البحر الرائق :۶/ ۹۸) صاحبِ حیثیت اور مالداروں کے لئے بہتر یہ ہے کہ نصف صاع پہ تکیہ نہ کریں! آگے بڑھ کے ہر صنف میں سے ایک صاع یا اس کی قیمت صدقۃ الفطر میں ادا کریں؛ تاکہ غریبوں کا بھلا ہو سکے۔ بذل المجہود میں ہے: قولہ صاعًا من كل شيئ أي من الحنطة وغيرها لكان أحسن ۔(454/6.ط بیروت)

متفرق مسائل

۱۔اگر عورت صاحبِ نصاب ہو اس پر بھی صدقۃ الفطر واجب ہے؛ مگر عورت پر کسی اور کی طرف سے فطرہ نکالنا ضروری نہیں، نہ بچوں کی طرف سے، نہ ماں باپ کی طرف سے، نہ شوہر کی طرف سے۔

(ردالمحتار: ۳/ ۳۰۷)

۲۔جس نے کسی وجہ سے رمضان کے روزے نہیں رکھے اس پر بھی صدقۃ الفطر واجب ہے، اور جس نے روزے رکھے اس پر بھی واجب، دونوں میں کچھ فرق نہیں۔(فتاویٰ رحیمیہ:۵/ ۱۷۲)

۳۔کفار کو زکوٰۃ، عُشر اور دوسرے صدقاتِ واجبہ (صدقۃ الفطر، نذر اور کفارہ) دینا جائز نہیں ہے؛ البتہ نفلی صدقات، کافر کو دینے کی گنجائش ہے؛ لیکن کسی مسلمان فقیر کو دینا ہی زیادہ بہتر ہے۔(الدر المختار 2/ 351)

۴۔آپ اگر دوسرے ملک مثلاً امریکہ میں ہے اور اہلیہ، بچے ہندوستان میں ہیں تو آپ پر امریکہ کے حساب سے اور اہلیہ بچوں پر ہندوستان کے حساب سے صدقۃ الفطر ادا کرنا پڑے گا۔(ردالمحتار 2/ 355)

۵۔مردوں پر جس طرح اپنی طرف سے صدقۃ الفطر دینا ضروری ہے، اس طرح نابالغ اولاد کی طرف سے بھی صدقۃ الفطر ادا کرنا ضروری ہے۔ والدین، بالغ اولاد اور بیوی کی طرف سے دینا واجب نہیں ہے، ہاں اگر ان کی طرف سے دیدے تو ادا ہو جائے گا۔ اگر یہ حضرات خود صاحب نصاب ہوں تو صدقۃ الفطر انہی کے ذمہ واجب ہے.(فتاویٰ عالمگیری)

۶۔مرحومین کی طرف سے صدقۃ الفطر واجب نہیں ہے۔(کتاب المسائل، ۲/ ۲۸۲)

فقہ وفتاویٰ

آپ کے شرعی مسائل

از: مفتی ندیم الدین قاسمی*

مسجد میں داخل ہو کر سلام کرنا

سوال: مسجد میں نماز کے وقت کچھ لوگ ذکر و تسبیحات میں مشغول رہتے ہیں اور کچھ لوگ خاموش بیٹھے رہتے ہیں، تو ایسے وقت میں مسجد میں داخل ہونے والے اونچی آواز سے سلام کر سکتے ہیں؟

جواب: مسجد میں داخل ہوتے وقت سلام کرنا چاہیے؛ بشرطے کہ لوگ بیٹھے ہوئے ہوں، تلاوت یا درس وغیرہ میں مشغول نہ ہوں اور اگر مشغول ہوں تو منع ہے؛ البتہ اگر کوئی خاموش بیٹھا ہو تو اس کے پاس جا کر آہستہ آواز سے سلام کیا جا سکتا ہے، بشرطیکہ نماز اور قرآن پڑھنے والوں تک آواز نہ پہنچے۔

(فتاویٰ ہندیہ، ۵/ ۳۲۵، بہ حوالہ بنوری ٹاون)

بے وضو قرآن پاک کی آیات ٹائپ کرنا

سوال: بے وضو قرآن کریم کو چھونا اور لکھنا دونوں نا جائز ہے، لیکن اگر کوئی ٹائپسٹ بے وضو بذریعہ کی بورڈ قرآن کریم کی آیت کمپوز کر رہا ہے تو اس کا کیا حکم ہے؟

جواب: بے وضو قرآن کریم کو چھونا اور لکھنا دونوں تو نا جائز ہے ہی، ایسے ہی بے وضو قرآن کی آیت کو ٹائپ کرنا بھی مکروہ ہے، چاہے کسی بھی ذریعہ سے ہو۔ (مستفاد از: بدائع الصنائع: ۱/ ۱۳۹)

حروفِ مقطعات والی انگوٹھی کا استعمال

سوال: حروفِ مقطعات والی انگوٹھی کا استعمال کیسا ہے؟ کیا اس کو پہن کر بیت الخلاء میں جانا درست ہے؟

جواب: حروفِ مقطعات والی انگوٹھی کے استعمال میں کوئی حرج نہیں ہے، لیکن چونکہ یہ حروفِ مقطعات قرآن کریم کی آیات ہیں لہذا کراہیت کے مقامات سے احتیاط ضروری ہے۔ (الھندیہ ۵/ ۳۴۷)

* استاذ شعبہ عالمیت ادارہ ہذا